رسائل و مسائل

حصّہ اوّل

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرستِ مضامین

جماعت اسلامی اور اس کی تحریک سے متعلق ۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

پچھلے کئی سالوں میں رسائل و مسائل کے عنوان سے ترجمان القرآن میں لوگوں کے جو سوالات اور میرے جوابات شائع ہوتے رہے ہیں ان کو اب فائدۂ عام کے لیے یکجا شائع کیا جارہا ہے۔ ان میں مختلف تمدنی، سیاسی، معاشی، علمی اور مذہبی مسائل پر ناظرین کو بکثرت ایسے سوالات کے مختصر اور دوٹوک جوابات مل جائیں گے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں کھٹکتے ہیں بعض سوالات اور جوابات اس مجموعہ میں ایسے بھی ہیں جو بظاہر قصۂ ماضی معلوم ہوتے ہیں لیکن بہر حال ان کی ایک تاریخی قدر و قیمت بھی ہے۔ اور علاوہ بریں ان میں بھی بہت سے ایسے اصولی مسائل کی توضیح ہوگئی ہے جن سے کبھی نہ کبھی مسلمان آبادی کو سابقہ پیش آسکتا ہے۔

ہر مضمون کے اختتام پر اس کی تاریخ اشاعت درج کردی گئی ہے تاکہ لوگ اس کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکیں لیکن تاریخ اشاعت درج کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مجموعہ کا ہر مضمون ترجمان القرآن کے اس مضمون کی لفظ بہ لفظ نقل ہے جس کا حوالہ اس کے نیچے درج کیا گیا ہے۔ دراصل میں نے اس مواد کو ترتیب دیتے وقت جگہ جگہ عبارات میں ضروری اصلاحیں، ترمیمیں اور توضیحیں بھی کی ہیں اور بعض مقامات پر اضافے بھی کردیے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۱ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء

تفسیرِ آیات

و

تاویلِ احادیث

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے متعلق چند سوالات

سوال:-

سیاسی کشمکش حصہ سوم میں صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں :-

" پہلا جز یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے' دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔"

کیا دعوتِ توحید کے ساتھ رہائی بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰؑ نے کیا، غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں:-

"دوسرا جز، یہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں۔ جو بندگی واطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں۔"

کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی نے بھی دینِ موسوی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ حالانکہ کسی خاص سعی اور کشمکش کا پتہ قرآنِ پاک سے نہیں چلتا۔ جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے لکھو کھا آدمی تمام کے تمام مشرکانہ طاقتوں کے زیر دست رہنے کے باوجود ایک دم ایمان لے آئے ہوں۔ جو برتاؤ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا وہی برتاؤ

حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بھی اس زمانہ کے کچھ بنی اسرائیل حکومت کی طاقت کو حرکت میں لاکر کر سکتے تھے۔ اور اگر ان میں کچھ کافر تھے تو وہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے یا نہیں؟

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (طٰہٰ: ۹۴)

یہ حضرت ہارونؑ کا مقولہ ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لڑانے آیا ہوں؟

جواب:۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ متعدد مقامات پر آیا ہے، ابتدائی مکی سورتوں میں جو قرآن مجید کے آخری حصہ میں ملتی ہیں، یہ ذکر کیا جا چکا تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو خدا کی بندگی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوا ہے:۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۔ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۔ (النازعات: ۱۷ - ۱۹)

اس میں رہائی بنی اسرائیل کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے البتہ بعد کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصبِ نبوت پر حضرت موسیٰؑ کے تقرر کے دو مقصد تھے۔ اوّل فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینا۔ دوسرے اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر اس مسلمان قوم کو، جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مسلمان چلی آ رہی تھی اور حضرت یوسفؑ کے بعد چار یا پانچ صدیوں کے دوران میں کسی وقت کفار سے مغلوب ہو کر رہ گئی تھی، کفار کے تسلط سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ حضرت موسیٰؑ نے پہلے مقصد کی طرف پہلے دعوت دی اور دوسرے مقصد کو بعد میں لیا۔ دوسرے مقصد کو پہلے مقصد سے غیر متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔ ہر نبی کے مشن کا دوسرا مرحلہ لازماً یہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی دعوت کو رد کر دیا ہے ان کے تسلط سے اہلِ ایمان کو نکالنے کی کوشش کرے۔

آپ کا یہ سوال "کہ کیا سب بنی اسرائیل نے دینِ موسوی قبول کر لیا تھا؟" یہ ظاہر کرتا

ہے کہ آپ کے خیال میں بنی اسرائیل غالباً کافر تھے اور حضرت موسیٰؑ شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دی۔ حالانکہ فی الواقع صورتِ حال یہ نہ تھی۔ بنی اسرائیل تو تھے ہی پیغمبروں کی اولاد، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ ان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ حضرت یوسفؑ بھی ان کے بزرگوں میں تھے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے ان کے آخری نبی (حضرت یوسفؑ) کو گزرے ہوئے چار یا پانچ سو برس سے زیادہ نہ گزرے تھے۔ اس مدّت میں وہ کافر نہیں ہو گئے تھے کہ ان کو کفر سے اسلام میں لانے کا کوئی سوال درپیش ہوتا۔ نہ ان میں موسیٰؑ کی دعوت کا کوئی منکر تھا۔ البتّہ ان کے اندر اتنا ضعف آ گیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں فرعون اور اس کی قوم کی طاقت سے تصادم کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نوجوان تو حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے بڑی حد تک تیار ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے سن رسیدہ اور جہاندیدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موسیٰؑ کا ساتھ دینے کے معنیٰ اپنی دنیا کو تباہ کر لینے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس حالت کا نقشہ بالکل صاف طور پر سامنے آجاتا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۵، و سورۂ یونس رکوع ۹)

اس بات کا قرآن سے کہیں نشان نہیں ملتا کہ ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں سے کوئی عملاً فرعون کا ساتھ دے کر حضرت موسیٰؑ کی مخالفت کر رہا تھا۔[1] بلکہ قرآن اور بائبل دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے مسلّم لیڈر بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو ایک اسرائیلی بھی پیچھے نہ رہا۔

حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں جس تنزل کو بنی اسرائیل پہنچے اس پر حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر

---

[1] صرف ایک قارون اس سے مستثنیٰ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا گیا ہے (المومن رکوع ۳) لیکن اگر بائبل کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید آخر کار اس نے بھی مصر میں منافقانہ روش اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے خلاف اس کے جس فتنے کا بائبل ذکر کرتی ہے وہ مصر سے نکلنے کے بعد کا قصّہ ہے۔

بنی اسرائیل کو قیاس کرنا درست نہیں۔ اگر اس وقت وہ اتنے سخت اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کام کے لیے منتخب ہی نہ فرماتا۔

حضرت ہارونؑ نے جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اصل لیڈر اور ان کے جماعتی نظام کے ذمّہ دار حضرت موسیٰؑ تھے اور حضرت ہارونؑ ان کے مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں حضرت ہارونؑ کسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والے معاملے پر کوئی فیصلہ کن کارروائی کرتے ہوئے اس بنا پر ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ان سے نہ ہو جائے جو اصل ذمّہ دار شخص کی پالیسی کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔

مسیح علیہ السلام کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے وہ بالکل دوسرے حالات سے متعلق ہے۔ اس وقت کوئی اسلامی نظامِ جماعت یہودیوں میں موجود نہیں تھا کہ حضرت مسیحؑ کے اس قول کو یہ معنی پہنائے جاسکیں کہ آپ اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دے رہے تھے بخلاف اس کے حضرت ہارونؑ کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظامِ جماعت موجود تھا اور وہ بجا طور پر اس امر میں احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کر دے۔

(ترجمان القرآن، رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ، جولائی و اگست ۱۹۴۳ء)

قرآنِ عربی پر غیر عرب کیوں ایمان لائیں؟

سوال:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۔ (ابراہیم: ۴) پڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ ہماری اور ہمارے آباو اجداد کی زبان عربی نہیں تھی۔ پھر قرآن کے عربی ہونے پر ہم کیوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے مکلف تھے؟

جواب:۔

آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ ہر قوم صرف اسی دعوت پر ایمان لانے کی مکلّف ہونی چاہیے جو اس کی اپنی زبان میں دی گئی ہو۔ دوسری کسی زبان میں آئی ہوئی دعوت اگرچہ وہ حق ہو، اگرچہ وہ منجانب اللہ ہو، اگرچہ وہ ترجموں، تفسیروں، تشریحوں اور عملی نمونوں کے ذریعہ سے آپ تک پہنچ جائے پھر بھی وہ واجب الاتباع نہ ہونی چاہیے کیونکہ وہ آپ کی اپنی زبان میں نہیں بھیجی گئی ہے، اگر یہی آپ کا مطلب ہے تو یہ محض ایک غلط فہمی ہے جو مذکورہ بالا آیت کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے پیدا ہوگئی ہے۔ آیت کا مقصد دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی کسی قوم میں کوئی رسول بھیجا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ رسول خاص اسی قوم کے لیے ہو یا تمام دنیا کے لیے۔ بہرحال اس نے اپنے اوّلین مخاطب لوگوں کو ان کی اپنی زبان ہی میں خطاب کیا ہے تاکہ وہ اس کی بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اور ان کو یہ حجّت پیش کرنے کا موقع نہ ملے کہ "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر قوم کے لیے لازماً الگ ایک مستقل نبی ہی آنا چاہیے۔ جو اس کو اپنی زبان ہی میں خطاب کرے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک قوم کو دوسری قوم کے اہلِ ایمان اس کی اپنی زبان میں قابلِ فہم طریقہ سے خدائی تعلیم پہنچادیں۔ تب بھی وہ محض اس بنا پر اسے رد کردینے میں حق بجانب ہو کہ نبی خود براہِ راست خدا کی کتاب اس کی زبان میں لے کر نہیں آیا ہے، یہ بات نہ اس آیت میں کہی گئی ہے اور نہ اس کے الفاظ میں ایسی کوئی گنجائش ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے۔ آخر کون سی معقول وجہ اس بات کے لیے پیش کی جاسکتی ہے کہ جس شخص کو قرآن کی تعلیم کا لب لباب اس کی مادری زبان میں واضح طور پر پہنچ گیا ہو وہ اس پر ایمان نہ لانے میں حق بجانب ہو؟

سوال:۔

ایک سکھ دوست کو مطالعہ کے لیے کچھ لٹریچر دیا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران میں موصوف کی طرف سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ تم کہتے ہو کہ خدا پیغمبروں سے کلام کرتا ہے اور اس نے اپنے ان خاص بندوں کے ذریعہ سے نوعِ انسانی

کے لیے ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی بھیجا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا اہم نظام ایک ایسی زبان میں کیوں پیش کیا گیا ہے جو ایک خاص خطۂ ارضی میں بولی جاتی ہے؟ کیوں نہ اس خدا نے جو قادر مطلق کہلاتا ہے ایک عالم گیر زبان بنا دی تاکہ ہر کوئی اس کے کلام سے یکساں مستفید ہوتا؟ عربی قرآن شریف تو صرف عربوں ہی کے لیے مفید ہے۔

جواب:

آپ کے جن سکھ دوست نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اگر اپنے تخیل کو تھوڑی حرکت اور دیتے تو اس سے بڑھ کر وہ یہ سوال بھی کر سکتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ براہِ راست ایک ایک انسان کے پاس خدا نے کیوں نہیں بھیجا، کیونکہ جب وہ قادر مطلق ہے تو ایسا بھی کر سکتا ہے۔[1]

دراصل یہ لوگ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں فرمایا ہے جس سے دنیا کے اس نظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئے جو اپنی فطری رفتار پر چل رہا ہے، انسانوں میں زبان کا اختلاف اور اس بنا پر نوعِ انسانی میں چھوٹے اور بڑے حلقے بن جانا ایک فطری چیز ہے جو خود اللہ تعالیٰ ہی کی مشیّت کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اگر قادر مطلق ہے تو اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی سلطنت کا نظام اٹل قوانین پر چل رہا ہے۔ ان ہی قوانین کے تحت قوموں کی زبانوں اور ان کی روایات میں تنوع نمودار ہوتا ہے اگر "اسپرانٹو" کی قسم کی کوئی زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی جاتی تب بھی وہ نہ تو قوموں کی مادری زبان بن سکتی تھی نہ اس کے ادب سے

---

[1] یہ اعتراض بالکل اسی نوعیت کا ہے جیسے عہدِ قدیم کے کفار و مشرکین کہتے تھے کہ نبی اگر سچا ہے تو اس کے ساتھ بڑے بڑے خزانے کیوں نہیں ہیں کہ آرام کی زندگی گزارے اور اپنی دعوت کو خوب پھیلا سکے۔ یا نبی انسان کیوں ہے اور انسانی ضروریات اور کمزوریاں کیوں رکھتا ہے اسے تو فرشتہ ہونا چاہیے اور فوق الفطری قوتوں سے اپنی تحریک کو پھیلانا چاہیے۔

قلوب متاثر ہو سکتے تھے اور نہ لوگ اس کی ادبی نزاکتوں کو محسوس (APPRECIATE) کر سکتے تھے۔ اِلّایہ کہ قوموں کی مادری زبانوں کو اللہ تعالیٰ فوق الفطری طریقہ سے مٹا دیتا اور فوق الفطری طریقہ ہی سے اس "اسپرانٹو" کو زبردستی تمام قوموں کی زبان بنا دیتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک کام اس کے دوسرے کام کو مٹانے کے لیے نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زبانوں کے سابق فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا کام انجام دیا ہے۔

یہ اعتراض کہ عربی میں قرآن شریف صرف عربوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا جب کہ اللہ نے صرف کتاب نازل کی ہوتی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب کے ساتھ رہنما بھی پیدا کیا۔ اس رہنما نے پہلے انسانوں کی ایک قوم کو، جس کی زبان میں کتاب نازل ہوئی تھی، خطاب فرمایا اور اس قوم کو تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعہ سے اس نظام کے سانچے میں ڈھال دیا جو کتاب کے منشاء کے مطابق تھا۔ پھر اس قوم کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو نبی کی قائم مقام بن کر اسی طرح خطاب کرے اور اسی طرح تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعہ سے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے جس میں پہلے وہ خود ڈھالی گئی تھی۔ جو جو قومیں اس طریقہ سے اثر کو قبول کرتی جائیں وہ دوسری قوموں کے لیے یہی خدمت انجام دیں۔ یہ اس تعلیم کو عام کرنے کی فطری راہ تھی اور دنیا میں جس تحریک نے بھی عالمگیر دعوت کا کام انجام دیا ہے خواہ وہ خدا پرستانہ ہو یا کسی دوسری نوعیت کی۔ بہرحال اس نے فطرتاً یہی راہ اختیار کی ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی کتاب صرف اسی قوم کے لیے مفید ہے جس کی زبان میں وہ لکھی گئی ہو تو پھر دنیا کی علمی تاریخ کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا۔ پھر تو انسانی تصنیفات کو بھی زبانوں کے لحاظ سے قوموں کے لیے مخصوص کر دینا ہو گا اور ترجمہ اور بین الاقوامی تبلیغ کے تمام دوسرے ذرائع کے فائدے سے انکار کر دینا ہو گا حالانکہ یہی چیزیں ہیں جن کے بل پر بڑی بڑی تحریکوں کی دعوت اور بڑی بڑی انقلابی شخصیتوں کے پیغام دنیا

کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتے رہے ہیں۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ محض عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے عرب قوم کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا جائے۔

اگر کوئی شخص اس چیز سے مطمئن نہ ہو اور برابر اپنے اس اصرار پر قائم رہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اسی طرح اللہ کو کرنا چاہیے تھا تو اسے اپنی رائے پر جمے رہنے کا اختیار حاصل ہے مگر سوال یہ ہے کہ ایسے ایسے سوالات کو سدِ راہ بنا کر اگر ایک شخص ایک کتاب یا ایک پیغام سے استفادہ کرنا نہ چاہتا ہو تو نقصان کس کا ہے؟ یہ رویّہ طالبانِ حق و صداقت کا نہیں ہوتا۔ وہ تو جگہ جگہ ٹوہ لگاتے پھرتے ہیں کہ سچائی کی روشنی کہاں ہے اور کہاں سے وہ ملتی ہے۔ اگر آدمی دنیا کی ہر کتاب، ہر پیغام اور ہر تعلیم کے مقابلہ میں دل و دماغ پر کسی نہ کسی قسم کا قفل چڑھا لے تو پھر وہ ایک قدم بھی زندگی کی سیدھی راہ پر نہیں چل سکتا۔

(ترجمان القرآن، رجب، شوال ۱۳۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۱۹۴۴ء)

بعثت سے پہلے انبیاء کا تفکر

سوال:۔

آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام کے رکوع ۹ سے تعلق رکھنے والے ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ:۔

"وہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) ھٰذَا رَبِّیْ کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے اصل اعتبار ان کا نہیں، بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر نبوت وہبی ہوتی تو حضرت ابراہیمؑ کو عام انسانوں کی طرح

خدا کے الٰہ ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے میں شک اور تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوّت ایک کسبی معاملہ ہوا اور ایک فلاسفر اور نبی کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔"

جواب :۔

معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا۔ اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے نیز آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا، اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا ایک دوسرے کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے یہ چیز بھی سائل کے لیے غلط فہمی کی موجب ہوئی ہے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہیں ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو چنانچہ فرمایا:۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (شوریٰ: ۵۲)

"تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔"

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ: ۷)

"اور اللہ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا۔"

اس کے ساتھ قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوّت سے پہلے علم و معرفت کے انہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے تھے وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا اب انہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دیتی تھی کہ وہ حق ہیں اور انہی صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔
یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار بتکرار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ — پھر کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے
مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ — ایک دلیل روشن پر تھا (یعنی عقلی و فطری)

مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ (ہود: ۱۷)

ہدایت پر) اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا۔ (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی۔ (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے۔)

پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔

یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ (ہود: ۲۸)

اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی نبوت) سے بھی نوازا اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی تو اب کیا ہم زبردستی اسے تمہارے سر چپیک دیں۔

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ اور آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ دہراتے ہیں اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید و معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انھیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر اور عقلِ عام (COMMEN SENSE) کا استعمال ان قیاس آرائیوں اور خرص و تخمین (SPECULATION) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے

آثار کو دیکھو۔ اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ سائل نے اپنے سوال میں جس آیت کی تفسیر کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا ہے خود اسی کے ماقبل و مابعد کا مضمون اگر وہ پڑھیں تو دیکھیں گے کہ وہاں بھی مقصود کلام یہی بتانا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق کس طرح حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد ۲۵، عدد ۱، ۲، ۳، ۴)

عصمتِ انبیاء

سوال :۔

"یہ امر مسلم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی۔ جیسے لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ۔ (البقرۃ: ۳۵) کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔"

جواب :۔

نبی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کی طرح اس سے بھی خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی اوّل تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔

پھر یہ بات بھی لائقِ غور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو نافرمانی سرزد ہوئی تھی وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰؑ سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا

اقرار کیا کہ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّينَ (الشعراء: ۲۰) یعنی یہ فعل مجھ سے اس وقت سرزد ہوا تھا جب راہِ ہدایت مجھ پر کھلی نہ تھی۔

مختصراً یہ بات اصولی طور پر سمجھ لیجئے کہ نبی کی معصومیت فرشتے کی سی معصومیت نہیں ہے کہ اسے خطا اور غلطی اور گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو۔ بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ نبوت کے ذمہ دارانہ منصب پر سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بطور خاص اس کی نگرانی وحفاظت کرتا ہے اور اسے غلطیوں سے بچاتا ہے اور اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش اس سے سرزد ہوجاتی ہے تو وحی کے ذریعہ سے فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے تاکہ اس کی غلطی ایک پوری امت کی گمراہی کی موجب نہ بن جائے۔

(ترجمان القرآن رجب، شوال ۶۳ھ جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

ختمِ نبوّت

سوال :-

میرے ایک دوست ہیں جو مجھ سے بحث کیا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے ایک رشتہ دار جو مرزائی ہیں ان کو اپنی جماعت کی دعوت دیتے ہیں مگر وہ میرے دوست ان کے سوال کا جواب پوری طرح نہیں دے سکتے۔ انھوں نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں خود تو جواب نہ دے سکا۔ البتہ میں نے ایک صاحبِ علم سے اس کا جواب پوچھا۔ مگر کوئی ایسا جواب نہ ملا جس سے میری اپنی ہی تسلی ہوجاتی۔ اس لیے اب آپ سے پوچھتا ہوں۔

مسئلہ یہ ہے کہ مرزائی حضرات لفظ "خاتم" کے معنی نفی کمال کے لیتے ہیں نفی جنس کے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خاتم کا لفظ کہیں بھی نفی جنس کے ساتھ استعمال نہیں ہوا اگر ہوا ہو تو مثال کے طور پر بتایا جائے، ان کا چیلنج ہے کہ جو شخص عربی لغت میں خاتم کے معنی نفی جنس کے دکھا دے اس کو انعام

ملے گا۔ نفی کمال کی مثالیں وہ یہ دیتے ہیں کہ مثلاً کسی کو خاتم الاولیاء کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولایت اس پر ختم ہو گئی۔ بلکہ حقیقی مطلب یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا کمال اس پر ختم ہوا۔ اقبالؔ کے اس فقرے کو بھی وہ نظیر میں پیش کرتے ہیں:-

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہان آباد میں اس کے بعد کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ ہے کہ وہ جہاں آباد کا آخری باکمال شاعر تھا۔ اسی قاعدے پر وہ خاتم النبیین کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کمالاتِ نبوّت ختم ہو گئے نہ یہ کہ خود نبوّت ہی ختم ہو گئی۔"

جواب:-

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۵۰ء مجھے یہاں یکم اپریل کو ملا۔ جواب میں مزید تاخیر اس لیے ہوئی کہ میرے پاس خط لکھنے کا کاغذ نہ تھا۔ امید ہے کہ میری مجبوری کو پیش نظر رکھ کر تاخیر جواب سے درگزر فرمائیں گے۔

قرآن مجید کی کسی آیت کے متعلق اگر کوئی سوال پیدا ہو تو سب سے پہلے خود قرآن ہی سے اس کا مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد تحقیق کرنا چاہیے کہ کوئی حدیث صحیح بھی اس کی توضیح کرتی ہے یا نہیں۔ اگر دونوں ذرائع سے کوئی جواب نہ ملے (جس کا امکان بہت ہی کم ہے) تو البتہ کسی دوسرے ذریعہ کی طرف رجوع کرنا درست ہو سکتا ہے۔

ختم نبوّت کا ذکر سورۂ احزاب میں آیا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا۔ منہ بولے باپ کی بیوی اور بیٹیوں سے اسی طرح خلا ملا رکھتا تھا جس طرح ماں بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہوا کرتا ہے اور متبنیٰ بن جانے کے بعد وہ ساری حرمتیں اس کے اور منہ بولے باپ کے درمیان قائم ہو جاتی تھیں۔ جو نسبی رشتے کی بنا پر قائم ہوا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے حکم دیا کہ "منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی

بیٹا نہیں ہو جاتا" (سورۂ احزاب آیت ۴، ۵) لیکن دلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حرمت کا جو تخیل بیٹھا ہوا تھا وہ آسانی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو عملاً توڑ دیا جائے اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آ گیا کہ حضرت زیدؓ نے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینبؓ کو (جو ان کے نکاح میں تھیں) طلاق دیدی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اس سخت قسم کی جاہلی رسم کو توڑنے کا جب تک آپؐ خود اپنے متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے، متبنیٰ کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیل نہ مٹ سکے گا۔ لیکن آپ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطراف مدینہ کے یہود اور مکّہ کے کفّار اس فعل پر ایک طوفان عظیم برپا کر دیں گے اور آپ کو بدنام کرنے اور اسلام کو رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔ اس لیے آپ عملی اقدام کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود ہچکچا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا، اور آپ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا۔ اعتراضات اور بہتان طرازی اور افترا پرداز کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ انہی اعتراضات اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے سورۂ احزاب کی پانچویں رکوع کی آیات ۳۷ تا ۴۰ نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مومنوں کے لیے اپنے متبنیٰ لڑکوں کی بیوہ اور مطلقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم بجا لانے میں وہ کسی کے خوف سے ہچکچائے۔ اس بحث کو ختم اس بات پر فرماتا ہے کہ:۔

"محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔"

اس موقع پر یہ فقرہ جو ارشاد فرمایا گیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معترضین کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے۔

اول یہ کہ یہ نکاح بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ جس شخص کی مطلقہ بیوی سے نکاح

کیا گیا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعی بیٹا نہ تھا۔ اور آپ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔

دوم یہ کہ یہ نکاح محض جائز ہی نہیں ہے بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس جائز کام کو کرنا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور رسول کو لازم ہے کہ وہ خدا کے قانون کو عملاً جاری کرے اور جو چیزیں بے جا رسم کے طور پر حرام کر دی گئی ہیں ان کی حرمت توڑ دے۔

سوم یہ کہ یہ کام اس لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض نبی ہی نہیں ہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ اگر اب آپ کے ہاتھوں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔ آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپ سے چھوٹ جائے اسے وہ آکر پورا کر دے۔ لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کام جائز ہی سہی مگر اس کا کرنا کیا ضرور تھا۔

اب آپ خود دیکھ لیجئے کہ اس سلسلۂ بیان میں ختم کا حقیقی مفہوم کیا ہے اگر اسے نفی کمال کے معنیٰ میں لیا جائے تو یہاں یہ لفظ بالکل ہی بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔ موقع و محل صاف تقاضا کر رہا ہے کہ یہاں اس کے معنیٰ سلسلۂ نبوت کے قطعی انقطاع ہی کے ہونے چاہئیں۔

اس کے بعد حدیث کو دیکھئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ختم نبوت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ "میری اور انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک محل تھا جس کی عمارت بہت حسین بنائی گئی تھی مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی۔ اب وہ جگہ میں نے آکر بھر دی اور عمارت مکمل ہو گئی"۔ یہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے۔ آپ کو مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین میں مل جائے گی۔ اس تشریح کی رو سے نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ آخری اینٹ کی جگہ بھی بھر چکی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی نئی اینٹ آکر کہاں لگے گی؟ عمارت کے اندر یا اس کے باہر؟

اس کے بعد لغت کی طرف آیئے۔ عربی زبان کی کسی مستند لغت کو اٹھا کر لفظ ختم کے معنیٰ دیکھ لیجئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جو تاویل میں نے اوپر قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کی ہے عربی زبان بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ ختم کے اصل معنی مہر لگانے، بند کرنے اور کسی چیز کا سلسلہ منقطع کر دینے کے ہیں۔ خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا"۔ خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنی ہیں "کام پورا کر کے اس سے فارغ ہو گیا۔" خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنی ہیں "خط پورا کر کے اس

پر مہر لگادی۔ خود قرآن میں منکرین حق کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ "خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے"۔ یعنی ان کے دل قبولِ حق کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔ نہ ایمان ان کے اندر جاسکتا ہے نہ کفر ان میں سے نکل سکتا ہے پس حضورؐ کو خاتم النبیین کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ مکمل کر کے آپ کو اس پر مہر کے طور پر نصب کر دیا ہے، اب اس سلسلہ میں کوئی نیا نبی داخل نہیں ہوسکتا۔

(نیو سینٹرل جیل ملتان، ۱۶؍اپریل ۵۰ء)

علمِ غیبِ رُسُل

سوال:۔

"ایک عالمِ دین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ رسولؐ کو عالمِ غیب سے وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کو اللہ ان کے توسط سے اپنے بندوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔" استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (الجن: ۲۶-۲۸)

یعنی "وہ غیب کا عالم ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جس کو اس نے چن لیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگران لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے"۔

مصنف کی اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کو غیب کا صرف اتنا ہی علم دیا جاتا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ انھیں کوئی چیز نہ بتائی جاتی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے اور کیا وہ آیت جس سے مصنف نے استدلال کیا ہے۔ اس معاملہ میں فیصلہ کُن ہے؟

جواب :-

مصنف نے دراصل عوام الناس کے اس غلط خیال کی تردید کرنی چاہی ہے کہ رسول تمام مَاکَانَ مَا یَکُوْن کو جانتے ہیں اور خدا نے ان کو پورا علم غیب دے دیا ہے حتیٰ کہ جو کچھ خدا جانتا ہے وہی اس کا رسول بھی جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ باطل ہے اور اس کی تردید کی حد تک مصنف کی بات درست ہے لیکن اس کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ رسولوں کو بس اتنا ہی غیب کا علم دیا گیا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب تھا یہ بات قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور خود اس آیت سے بھی نہیں نکلتی جس سے مصنف نے استدلال کیا ہے قرآن مجید میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:-

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یوسف: ۹۶)

"میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دیدی گئیں مگر انھوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دی گئی تھی کہ انھوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی۔ لیکن انھوں نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے پھر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:-

یا امۃ محمد واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا و لبکیتم کثیرا (بخاری باب الصدقۃ فی الکسوف)

"اے محمدؐ کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے۔"

ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا کہ:-

انی لاراکم من ورائی کما اراکم (بخاری باب عظۃ امام الناس)

"میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔"

غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا۔ اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائدِ ایمانیہ سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات بھی حاصل ہونی چاہئیں جو فرائضِ رسالت انجام دینے میں ان کے لیے مددگار ہوں۔ جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے اسرار سے نائب السلطنت اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوتا ہے اسی طرح حکومتِ الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمائندے اور اس کے رسولؐ جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے یہ علم غیب رسولوں کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا نہ اس علم کی ضرورت ہی رکھتی ہے اور نہ اس کا تحمل ہی کر سکتی ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۵۳ھ، اگست ۱۹۳۴ء)

دہریّت ومادّہ پرستی اور قرآن

سوال:۔

آپ نے اپنی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں اصطلاحاتِ اربعہ کے جو معنی بیان کیے ہیں۔ ان سے، جیسا کہ آپ نے خود ذکر فرمایا ہے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کی طرف نبی بھیجا گیا ہو اور اس نے اسے خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے یا خدا کو الٰہ و رب بمعنی خالق و رازق ماننے کی دعوت نہ دی ہو۔ کیوں کہ ہر قوم اللہ کے فاطر و خالق ہونے کا اعتقاد رکھتی

تھی اس سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں منکرینِ خدا یعنی مادّہ پرست ملحدین اور دہریوں کا گروہ ناپید تھا حالانکہ بعض آیات سے ان لوگوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً:۔

وَمَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ۔ (الجاثیہ:۲۴)

"بس ہماری زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے کہ مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور یہ زمانہ یعنی نظمِ فطرت ہی ہمیں ہلاک کرنے والا ہے۔"

نیز موسیٰؑ و فرعون اور نمرود و ابراہیمؑ کے مذاکروں میں بعض آیات اس امر پر صریح الدلالت ہیں کہ یہ دونوں مادہ پرست اور دہریہ تھے مثلاً:۔

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ؟ (ابراہیم:۱۰)

"کیا خدا کے وجود میں بھی کوئی شک و شبہ ہے جو موجد ارض و سما ہے؟"

پھر دوسری آیت ہے:۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ؟ (الطور:۳۵)

"کیا وہ بدون کسی خالق کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا وہ خود خالق ہیں؟"

آپ نے دوسری آیات سے استدلال کرتے ہوئے ان آیتوں کی جو توجیہہ کی ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ ان آیاتِ متمسّک بہا کی دوسری توجیہیں ہو سکتی ہیں۔

جواب:۔

میں نے جہاں تک قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے سامنے ہیں ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کوئی قوم یا کوئی ہیئت اجتماعی (COMMUNITY) ایسی نہیں گزری ہے جو بحیثیت مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور رہے ہیں لیکن وہ اتنے قابلِ لحاظ نہ تھے کہ براہِ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں لیکن دعوت کا براہِ راست خطاب مشرکین ہی کی طرف رہا ہے اور عموماً توحید پر جو دلائل دیئے گئے

ہیں وہ اس انداز سے دیے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف الگ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

فرعون اور نمرود کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض قیاس سے لکھا ہے معتبر معلومات اس کے خلاف ہیں۔ آج ارضِ بابل اور ارضِ مصر دونوں کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے نہایت مفصل معلومات ہو چکی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فراعنہ اور فرماں روایان بابل دونوں ہی پروہت راجہ (PRIEST KINGS) تھے۔ جن الہٰوں کی پرستش ان کی قوم میں ہوتی تھی۔ ان کو یہ دونوں نہ صرف یہ کہ معبود مانتے تھے بلکہ یہی فرماں روا ان کے مہا پجاری (CHIEF PRIEST) ہوتے تھے اور انھیں ان آلہہ کے نمائندے ہونے کی حیثیت ہی سے مانا جاتا تھا۔ اسی کی تصدیق قرآن کے بیان سے بھی ہوتی ہے اور یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اس معنی میں دہریے نہیں تھے۔ جس معنی میں آج کل یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

لَہٗ مَا سَلَفَ کی تفسیر

سوال:-

تفہیم القرآن میں حرمتِ سود والی آیت فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (البقرۃ: ۲۷۵) پر حاشیہ لکھتے ہوئے جناب نے جو استدلال فرمایا ہے اس پر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ "وہ شخص جو پہلے کے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھا رہا ہے تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پاکر رہے۔" سوال یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے پر صحابہ کرامؓ نے کیا عمل فرمایا؟ اگر انھوں نے اخلاقی حیثیت کی بنا پر مستحقین کو مال واپس کیا ہے تو آپ کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز اگر صحابہؓ کا عمل ایسا ثابت

ہے تو آپ کو تفہیم القرآن میں اس کا حوالہ دینا چاہیے۔

جواب:۔

اس معاملہ میں قرآن کے الفاظ پر شاید آپ نے توجہ نہیں کی۔ "فَلَهٗ مَا سَلَفَ" کہنے کے بعد "وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ" جو فرمایا گیا ہے۔ اس کا آخر کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اس کے معنی یہی تو ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ پہلے کسی نے سود کھایا ہے یہاں اس کی معافی کا اعلان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقدمہ کو زیرِ تجویز رکھا گیا ہے۔ اگر وہ اپنی سود سے جمع کی ہوئی دولت کو اپنے لیے عیش و راحت اور شان و شوکت کا ذریعہ بنائے تو اس کی حیثیت ایسے شخص کی سی ہو گی جو اپنے پچھلے گناہوں پر کوئی ندامت نہیں رکھتا اس لیے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس شخص سے مختلف ہوگا جو اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو اور اپنی ظلم وجور سے کمائی ہوئی دولت کو اپنے عیش پر خرچ کرنے کے بجائے خلق اللہ کی خدمت پر صرف کرے تاکہ اس کے اس جرم کی کسی حد تک تلافی ہو جائے جو وہ حالتِ جاہلیت میں کرتا رہا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق اگر کوئی نظائر ہمیں تاریخ میں نہ بھی ملیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکم کی منشاء کی طرف جو صریح اشارہ قرآن شریف کر رہا ہے اس سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۲ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

اتباعِ علماء وصلحاء

سوال:۔

ایک عالمِ دین اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ "شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ علماء اور صلحاء کو امام اور ہادی مان کر ان کے اقوال کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کیا جائے۔" پھر فرماتے ہیں۔ "ائمہ سلف اور بزرگانِ دین کے علوم اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

لیکن ان کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے دین ماننا شرک ہے۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

"کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔"

آگے چل کر پھر فرماتے ہیں:۔

"کہ رسول اور امیر کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے۔"

آخر میں ایک مقام پر ان کا ارشاد ہے:۔

"بلکہ عام طور پر انسانوں کی اطاعت کو قرآن خطرناک قرار دیتا ہے۔"

مصنف کی یہ باتیں کہاں تک درست ہیں؟

جواب:۔

ان اقوال میں صحیح اور غلط دونوں طرح کی باتیں ملی جلی ہیں فی الجملہ صاحب موصوف نے حق بات کہنے کے ساتھ ایک طرح کے بے جا تشدد سے کام لیا ہے مسلمانوں میں جاہل پیروں اور علماء سوء کی اندھی تقلید اور جاہلانہ اطاعت کے جو آثار نظر آتے ہیں ان پر جتنا بھی اظہارِ غضب کیا جائے جائز اور بجا ہے لیکن افسوس ہے کہ مؤلف نے اصلاح کے جوش میں علماء حق اور صلحاء اُمت اور ائمہ ہدایت کی اطاعت اور پیروی کو بھی گمراہی قرار دیدیا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہہ دیا حالانکہ اگر وہ انہی آیاتِ قرآنی پر غور فرماتے جن کو انھوں نے استدلال میں پیش کیا ہے تو انھیں خود احساس ہو جاتا کہ وہ حق سے بہت کچھ تجاوز کر گئے ہیں۔ شرک جس چیز کا نام ہے وہ تو بغیر اس کے متحقق نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص خدا کے سوا کسی دوسرے کو حقیقی معنوں میں حکم دینے اور منع کرنے کا حقدار قرار دے۔ یا خدا کے امر و نہی کے مقابلہ میں یا اس کے برابر کسی اور کے امر و نہی کو واجب الاطاعت سمجھے۔ لیکن یہ مخفی نہیں ہے اور غالباً جناب مؤلف خود بھی جانتے ہوں گے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں شرک کا حکم لگا دینا زیادتی ہے۔ جو شخص کسی بزرگ کے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ وہ راہِ راست پر ہیں اور خدا کی شریعت اور اس کے احکام

کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر جانتے ہیں اور اس بنا پر وہ ان کی پیروی یہ سمجھتے ہوئے کرتا ہو کہ ان کی پیروی رضائے الٰہی کی پیروی ہے ایسے شخص کو آخر شرک کا الزام کیسے دیا جا سکتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ کس کا اتباع کرنا جائز ہے اور کس کا اتباع گمراہی ہے۔ تو قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (احزاب: ۱) وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف: ۲۸) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (القلم: ۸) وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (الدہر: ۲۴) یعنی کافروں اور منافقوں کی، خدا کو بھول جانے والوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں کی، افراط پسندوں اور حق کو جھٹلانے والوں اور گناہ گار ناشکروں کی پیروی نہ کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل: ۴۳) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: ۹۰) یعنی اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کرو۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مؤلف نے صحیح اور غلط کو خلط ملط کر دیا ہے اور افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں۔ علماء اور صلحاء کرام کو ہادی ماننا کوئی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ غیر عالم اور غیر صالح کو لازم ہے کہ ان کی بات مانے اور ان کے پیچھے چلے البتہ ان کے قول کو اللہ کے قول کی طرح سمجھنا ضرور گناہ ہے۔ اسی طرح یہ درست ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔ لیکن جو شخص یہ سمجھ کر بزرگوں کی پیروی کرے کہ وہ خود کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتا اور بزرگان سلف نے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں۔ وہ ہرگز کسی جرم یا گناہ کا مرتکب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے پیروی کے لیے جن بزرگوں کو چن لیا ہے ان کا انتخاب درست نہیں ہے۔

آپ تقلید جامد اور اندھی پیروی کی جتنی چاہیں برائی کر سکتے ہیں سب بجا اور درست، آپ یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ ولایت، امامت، اجتہاد اور علم و فضیلت بزرگوں پر ختم نہیں ہو گئیں۔ آج بھی یہ سب مرتبے حاصل ہو سکتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن تقلید کی مخالفت اور اجتہاد کا شوق اگر اس حد تک پہونچ جائے کہ بزرگان سلف

کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو جائے اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو خواہ مخواہ ڈھا دینا ہی ضروری سمجھ لیا جائے اور محض نئی بات پیدا کرنے کی خاطر جدت طرازیاں کی جائیں، اور لوگ اہلیت کے بغیر اجتہاد شروع کر دیں اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کو بازیچۂ اطفال بنالیں تو یہ حق ہے کہ یہ گمراہی اندھی تقلید کی گمراہی سے بدرجہا زیادہ سخت اور دین کے حق میں بدرجہا زیادہ نقصان دہ ہے۔ مقلدین تو صرف اتنا ہی کرتے ہیں کہ جو دیواریں ان کے اسلاف اٹھا گئے ہیں ان پر زمانہ کی ضروریات کے مطابق کسی مزید تعمیر کا اضافہ نہیں کرتے لیکن وہ پچھلی عمارت کو جوں کا توں قائم رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ جدت پسند حضرات پچھلی دیواروں کو بھی ڈھاتے ہیں اور خود اپنے من مانے طرز پر نئی عمارت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت اگر فروغ پا جائے تو اندیشہ ہے کہ پورا دین ہی مسخ ہو جائے گا اور نہ معلوم اس کی شکل کیا سے کیا بنا کر رکھ دی جائے گی۔ (ترجمان القرآن، جمادی الاوّل ۵۳ھ اگست ۱۹۳۴ء)

قرآن و حدیث اور سائنٹیفک حقائق

سوال:۔

قرآن و حدیث میں بہت سے ایسے امور بیان ہوئے ہیں۔ جنھیں زمانۂ حال کی تحقیقات غلط قرار دیتی ہیں۔ اس صورت میں ہم قرآن و حدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً:۔

الف:۔ قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئی۔ بخلاف اس کے علماء دور حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب:۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں آفتاب ساکن ہے۔

ج:۔ اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک پیدا ہوتی ہے اس کے متعلق اسلام

کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے چمکتے اور آواز نکالتے ہیں. حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د:۔ کانا دجّال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقیّد ہے تو آخر وہ کون سی جگہ ہے آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے۔ پھر کیوں کانے دجّال کا پتہ نہیں چلتا؟

جواب :۔

مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق و تفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹفک طریقہ سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔ البتہ سائنسدانوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کیے ہیں ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پا جائے۔ مگر جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔

اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کردوں جنھیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے۔

الف:۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا، اس وقت تک محض نظریہ ہے ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ علی گڑھ، جہاں سے آپ یہ خط لکھ رہے ہیں ایک علمی مرکز ہے وہاں اس نظریہ پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو ملے گی۔ آپ خود انہی سے پوچھ لیجئے کہ یہ نظریہ

(THEORY) ہے یا واقعہ (FACT) اگر ان میں سے کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ دیجئے۔

ب :۔ علی گڑھ میں فلکیات (ASTRONOMY) جاننے والوں کی بھی کمی نہیں ذرا ان لوگوں سے پوچھئے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہیے۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کے سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں۔ جب کہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج :۔ قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (PROCESS) بیان کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ سائنٹیفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (UP TO DATE) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

د :۔ یہ کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں جو اس قسم کی باتیں مشہور ہوں ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ (ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۱۳۶۴ھ، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۵ء)

تحقیق حدیث دجال

سوال :۔

ترجمان القرآن میں کسی صاحب نے سوال کیا تھا کہ "کانا دجال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے۔ تو آخر وہ کون سی جگہ ہے؟ آج دنیا کا کونہ کونہ

انسان نے چھان مارا ہے پھر کیوں کانے دجّال کا پتہ نہیں چلتا؟" اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ "کانا دجّال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے" لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کم از کم تیس روایات میں دجّال کا تذکرہ موجود ہے جس کی تصدیق بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، شرح السنّہ بیہقی کے ملاحظہ سے کی جا سکتی ہے پھر آپ کا جواب کس سند پر مبنی ہے؟

جواب:-

میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال کہ کانا دجّال کہیں مقیّد ہے باقی رہا یہ امر کہ ایک بڑا فتنہ پرداز (الدجّال) ظاہر ہونے والا ہے تو اس کے متعلق جو احادیث میں خبر دی گئی ہے میں اس کا قائل ہوں اور ہمیشہ اپنی نماز میں وہ دعاءِ ماثورہ پڑھا کرتا ہوں جس میں منجملہ دوسرے تعوذات کے ایک یہ بھی ہے کہ اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال۔

دجّال کے متعلق جتنی احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجّال ظاہر ہونے والا ہے اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی اور وہ اِن اِن خصوصیات کا حامل ہوگا لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا؟ اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے۔ یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں۔ جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔ کبھی آپؐ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اٹھے گا۔ کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صیاد نامی اس یہودی بچے پر جو مدینہ میں غالباً ۲ھ یا ۳ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجّال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپؐ کو یہ قصّہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحر روم یا بحر عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد

جزیرے میں پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انھیں بتایا کہ وہ خود ہی دجّال ہے تو آپ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی۔ البتہ اس پر شک کا اظہار فرما دیا کہ اس بیان کی رو سے بحر روم یا بحر عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

یہ تردّد اول تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپؐ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں۔ اور آپؐ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپؐ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو۔ یا جس پر ایمان کے لیے ہم مکلف کیے گئے ہوں۔ پھر جب کہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ ابن صیاد پر آپ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجّال ہو اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھالی تھی کہ یہی دجّال ہے۔ مگر بعد میں وہ مسلمان ہوا حرمین میں رہا، حالتِ اسلام میں مرا اور اس کی نماز جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابن صیّاد پر دجّال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے۔ تمیم داری کے بیان کو حضورؐ نے اس وقت تقریباً صحیح سمجھا تھا مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیم نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجّال ہونے کی جو خبر تمیم کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضورؐ کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجّال آپؐ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے۔ یا آپؐ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضورؐ کا اندیشہ صحیح نہ تھا؟ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں۔ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس قسم کے معاملات میں نبیؐ کے قیاس و گمان کا درست نہ نکلنا ہرگز منصبِ نبوت پر طعن کا موجب نہیں ہے۔ نہ اس سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلف کیا ہے۔ اس اصولی حقیقت کو تابیرِ نخل والی حدیث میں

نبی کریمؐ خود واضح فرما چکے ہیں۔ (ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۶۵ھ، فروری ۴۶ء)

بہانہ جوئی کے لیے روایات کے سہارے

سوال:-

میں نے اپنے بعض اعزّہ اور بزرگوں کی خدمت میں فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے اس سلسلہ میں میرا تبادلۂ خیال ایک ایسے رشتہ دار سے ہوا جو اصطلاحی علم بھی رکھتے ہیں اقامتِ دین کے فرض کی اہمیت کے بھی منکر نہیں مگر ادائے فرض کے لیے آمادہ ہو جانے کے بجائے جہلاء کے سے عذرات پیش کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ حدیث ہے کہ اذا رایت شحا مطاعًا وھوًی متبعًا واعجاب کل ذی رأی برایہ فعلیک بخویصۃ نفسک[1] اس سے استدلال کر کے وہ اپنے آپ کو ادائے فرض سے بری کرتے ہیں اور اس کو اتنی وقیع اور وزنی دلیل سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں ان کے نزدیک پورے قرآن اور سارے ذخیرۂ حدیث کی حجت بھی غیر اہم ہے۔ مثلاً میں نے حدیث شریف مَن رأی منکم منکرا فلیغیرہ (مسلم) الخ اور لتاخذون ید المسئ" الحدیث اور "من احیا سنتی" الحدیث اور اسی طرح آیت کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰) اور وَلتَکُن مِّنکُم اُمَّۃٌ یَّدعُونَ اِلَی الخَیرِ الخ (آل عمران: ۱۰۴) اور بالخصوص وَاتَّقُوا فِتنَۃً لَّا تُصِیبَنَّ الَّذِینَ ظَلَمُوا مِنکُم الخ (الانفال: ۲۵) سب ہی کو ان کے اطمینان کے لیے پیش کر دیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس حدیث کا محمل یہ نہیں ہے کہ آپ فریضۂ اقامتِ دین سے سبکدوش ہو گئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ "شحِ مُطاع" اور "ہوائے متبع" ان سب زمانوں میں برسرِ عمل تھی۔ مگر انھوں نے مایوسی کو گناہ سمجھا اور سعی کی۔ تو کیا العیاذ باللہ وہ غلطی کے

---

[1] یعنی جب تو دیکھے کہ تنگ دلی کی بندگی اور خواہشِ نفس کی پیروی کی جا رہی ہے اور ہر شخص خود رائی میں مبتلا ہے تو پھر تجھے چاہیے کہ بس اپنی نجات کی فکر کرے۔ (سنن الترمذی: کتاب تفسیر القرآن)

مرتکب تھے؟ اب میں آپ سے اس حدیث کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جواب:۔

یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کسی پوری قوم میں یا ساری کی ساری دنیا میں "شحِ مطاع" اور "ہوائے متبع" کے سوا اب کچھ نہیں رہا۔ تجربے کی ضرورت ہے نہ کہ اپنی جگہ سمجھ بیٹھنے کی اگر کوئی شخص حق کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور تبلیغ کا جو حق ہے وہ ادا کر دے اور پھر تجربے سے ثابت ہو کہ کوئی بھی اپنی ہوائے نفس کی پیروی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور سب کے سب باطل پرستی پر مُصر ہیں تب اس حدیث کے منشاء کے مطابق آدمی کے لیے یہ درست ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑے اور صرف اپنی نجات سے غرض رکھے لیکن عملاً کوشش کیے بغیر پہلے ہی سے یہ سمجھ لینا کہ دعوت اور تبلیغ اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ محض ادائے فرض سے جی چرانے کا ایک بہانہ ہے۔ نبیؐ پر اس کی ذمہ داری ڈالنا بڑی جسارت اور سخت زیادتی ہے آج اگر ہم اس حدیث کو حجت بنا کر اپنا وہ فرض ادا کرنے کی کوشش نہ کریں جو مومن ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتا ہے تو دنیا میں ہم اپنے نفس کو مطمئن کر سکتے ہیں لیکن قیامت کے روز اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کی باز پرس کے جواب میں یہ حدیث معذرت کے طور پر پیش کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت ہمارے منہ پر تردید کر دی کہ میرا مدعا یہ نہ تھا اور ان لوگوں نے میری حدیث سے غلط معنی نکال کر محض حیلہ بازی کی تھی تو بتائیے کہ ہمارے پاس جوابدہی کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

دراصل اس حدیث کا یہ منشاء ہے ہی نہیں کہ بحیثیت مجموعی کسی پوری آبادی کے متعلق یہ قیاس کر لیا جائے کہ اس میں "شحِ مطاع" اور "ہوائے متبع" کے سوا کچھ نہیں ہے لہٰذا نصیحت اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں۔ بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ایسا ہو جس کے سامنے دعوتِ حق کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے پیش کیا جائے اور پھر اس کے رویّے سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنی شح اور اپنی ہوائے نفس کا بندہ بنا ہوا ہے تب اس کے اوپر تذکیر میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ آئی ہے کہ "اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ" (الاعراف:۱۹۹)

"فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى" (الاعلیٰ:۹)

سوال:۔

ایک صاحب جو علم دین سے بخوبی واقف ہیں خطبۂ جمعہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر کہ "میرے بعد ۳۰ سال خلافت رہے گی بعد میں شاہی دور شروع ہوگا اور آخر میں امام مہدی صاحب جن کا حسب و نسب یہ ہوگا تشریف لائیں گے اور خلافت قائم کریں گے۔" یوں حاشیہ آرائی کی کہ جو لوگ ظہورِ امام مہدی سے پہلے خلافت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ محض ڈھونگ رچاتے اور دکانداری چلاتے ہیں۔ اس حاشیہ آرائی کے متعلق رائے گرامی کیا ہے؟

جواب:۔

اس طرح کے استدلال جو لوگ حدیث سے کرتے ہیں وہ معلوم ہوتا ہے کہ علم سے بھی بے بہرہ ہیں اور خدا کا خوف بھی ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں سے اگر اسی طرح کا استدلال کیا جانے لگے تو انسان گمراہی کی آخری حد تک پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں حضورؐ نے یہ پیشینگوئی فرمائی ہے کہ مسلمان آخر کار یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل پڑیں گے۔ اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے۔ حتّٰی کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے زنا کی ہو تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کرے گا۔ اب اگر اس پیشین گوئی سے استدلال کر کے کوئی شخص یہود و نصاریٰ کی پیروی شروع کر دے اور کہے کہ حضورؐ خود یہ فرما گئے ہیں۔ لہٰذا آپ کا یہ قول تو بہرحال ہم پر صادق آنا ہی ہے تو ایسے شخص کے جاہل اور خوفِ خدا سے عاری اور گمراہ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

سوال:۔

آپ فرقہ پرستی کے مخالف ہیں مگر اس کی ابتدا تو ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ کہ "عنقریب میری امت ۷۲ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا۔" (بلکہ شیعہ حضرات تو

اصحاب کی جگہ اہل بیت کو لیتے ہیں) اب غور فرمائیے کہ جتنے فرقے موجود ہیں سب اپنے کو ناجی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ۔ پھر ان کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا ممکن نہیں تو ظاہر ہے کہ یہ حدیث حاکمیت غیر اللہ کے بقا کی گارنٹی ہے۔ بہت سے لوگ اسی وجہ سے فرقہ بندی کو مٹانے کے خلاف ہیں کہ اس سے حدیث نبوی کا ابطال ہوتا ہے۔

جواب:۔

جس قسم کا سوال آپ نے کیا ہے اس پر اگر آپ خود اپنی جگہ غور کر لیتے تو آپ کو آسانی سے اس کا جواب مل سکتا تھا۔ احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ جس سے مقصود اہل ایمان کو فتنوں پر متنبہ کرنا اور ان سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا لیکن وہ شخص کس قدر گمراہ ہو گا جو صرف اس لیے فتنہ برپا کرنا یا فتنوں میں مبتلا رہنا ضروری سمجھے کہ احادیث میں جو خبر دی گئی ہے اس کا مصداق بننا ضروری ہے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں کہا گیا ہے کہ بہت سے انسان جہنمی ہیں تو کیا اب کچھ لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنائیں تا کہ یہ خبر ان کے حق میں سچی نکلے؟

(ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

المہدی کی علامات اور نظامِ دین میں اس کی حیثیت

سوال:۔

ظہور مہدی کے متعلق آپ نے رسالہ "تجدید و احیائے دین" میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اختلاف کا پہلو یہ ہے کہ آپ مہدی موعود کے لیے کوئی

امتیازی واختصاصی علامات تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ احادیث میں واضح طور پر علاماتِ مہدی کا تذکرہ موجود ہے۔ آخر اس سلسلۂ روایات سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے۔

جواب:۔

ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی ومذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، ان وجوہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہور مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے اور اہل غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشاد نبوی پر اضافہ کیا ہے مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدیؑ موعود ہونے کے جھوٹے دعویٰ کیے ہیں ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انہی روایات نے بہم پہونچایا ہے۔

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں پر غور کیا ہے۔ ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات وتفصیلات اس طریقے سے کبھی آپؐ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہور مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرمادیا کرتے تھے لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپؐ کا طریقہ نہ تھا۔

سوال:

ضرورت بعثت مہدی کو "تجدید واحیائے دین" میں تسلیم تو کرلیا گیا ہے لیکن مہدی کا کیا کام ہوگا۔ اس مسئلہ کو نقلی تائید کے بغیر محض اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احادیثِ شریفہ کی روشنی

میں اس کی تفصیل کی جائے تو مناسب ہے نیز مہدئ موعود کے مراتب و خصوصیات اور ضرورتِ اطاعتِ مہدی وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ عام مجددین میں شمار کر دیا گیا ہے اگرچہ مجدد کامل اور مجدد ناقص کی تقسیم سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ غالباً یہاں "مجدد" کا لفظ بربنائے لغت استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحاً نہیں تاہم جب کہ مجدد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا اور مہدی موعود کو معصوم عن الخطاء ہونا ضروری ہے تو پھر اس بین فرق کے ہوتے ہوئے مہدی موعود کو مجدد کی فہرست میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب:

اوّل تو خود "لفظ مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہیں ہدایت یافتہ کے "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہو سکتا ہے جو راہِ راست پر ہو۔ "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہو گا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سرِ نو خلافت کو منہاج نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ بس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مختص اور ممتاز کرنے کے لیے "مہدی" پر "ال" داخل کیا گیا ہے لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاءؑ پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت بھی شرطِ اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ کہ مہدی کوئی امام معصوم ہو گا۔ دراصل یہ معصومیت غیر انبیاء کا تخیل ایک خالص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر

انسان کی نجات موقوف ہے انھیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً وکنایۃً بیان نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (اللیل: ۱۲) لہٰذا جو مسئلہ بھی دین میں یہ نوعیت رکھتا ہو اس کا ثبوت لازماً قرآن ہی سے ملنا چاہیے۔ مجرد حدیث پر کسی ایسی چیز کی بنا نہیں رکھی جاسکتی جسے مدارِ کفر وایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں۔ جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کرسکتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر وایمان کا فرق واقع ہوتا ہو، انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کردیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے اللہ کا رسول انھیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیے گئے ہوں۔

اب "مہدی" کے متعلق خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے بہرحال ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اسلام میں اس کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کے جاننے اور ماننے پر کسی کے مسلمان ہونے اور نجات پانے کا انحصار ہو۔ یہ حیثیت اگر اس کی ہوتی تو قرآن میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دو چار آدمیوں سے اس کو بیان کردینے پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ پوری امت تک اسے پہنچانے کی سعی بلیغ فرماتے اور اس کی تبلیغ میں آپ کی سعی کا عالم وہی ہوتا جو ہمیں توحید اور آخرت کی تبلیغ کے معاملے میں نظر آتا ہے۔ درحقیقت جو شخص علوم دینی میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ جس مسئلے کی دین میں اتنی بڑی اہمیت ہو اسے محض اخبارِ آحاد پر چھوڑا جاسکتا تھا اور اخبارِ آحاد بھی اس درجہ کی کہ امام مالکؒ اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے محدثین نے اپنے حدیث کے مجموعوں میں سرے سے ان کو لینا ہی پسند نہ کیا ہو۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول، جمادی الآخر ۶۴ھ، مارچ جون ۴۵ء)

مسئلہ مہدی

سوال:

چند حضرات نے جو نہایت دیندار اور مخلص ہیں "تجدید و احیائے دین" کی ان سطور کے متعلق جو آپ نے امام مہدی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں۔ احادیث کی روشنی میں اعتراضات پیش فرمائے ہیں جنھیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ میں اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ دعوتِ اقامتِ دین کے پورے کام میں شریعت کی پابندی ضروری ہے پس لازم ہے کہ ہر وہ چیز جو آپ کے قلم سے نکلے عین شریعت کے مطابق ہو اور اگر کبھی کوئی غلط رائے تحریر میں آئے تو اس سے رجوع کرنے میں کوئی تامل نہ ہونے پائے۔

امام مہدی کے متعلق جو سطور آپ نے صہ۳۱ تا صہ۳۳ تحریر فرمائی ہیں وہ ہمارے فہم کے مطابق احادیث کے خلاف ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے ترمذی اور ابوداؤد کی تمام روایات کا مطالعہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات کے راوی ضرور خارجی یا شیعہ ہیں لیکن ابوداؤد و ترمذی وغیرہ کے ہاں ایسی صحیح احادیث بھی موجود ہیں جن کے راوی ثقہ اور صدوق ہیں اور وہ آپ کی رائے کی تصدیق نہیں بلکہ تردید کرتی ہیں مثلاً ابوداؤد کی روایت ملاحظہ ہو:-

حدثنا محمد بن المثنی عن ام سلمة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یکون اختلاف عند موت خلیفة فیخرج رجل من اھل المدینة ھاربًا الی مکة فیاتیه ناس من اھل مکة فیخرجونه وھو کارہ فیبایعونه بین الرکن والمقام (کتاب المھدی)

اس روایت سے لے کر اخیر روایت تک ملاحظہ ہو۔ تمام راوی

ثقہ ہیں نیز بیہقی کی بھی ایک روایت مشکوٰۃ کی کتاب الفتن میں تحریر ہے۔

-ن ثوبان قال افرأیتم الرأیات السود قدجاءت من قبل خراسان فاتوھافان فیھاخلیفۃ اللہ المہدی۔

مندرجہ بالا احادیث سے آپ کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ المہدی کو اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی خصوصاً یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وجب علی کل مومن نصرۃ اوقال اجابتہ۔

نیز ترمذی کی ایک روایت کے یہ الفاظ بھی دیکھئے:۔

قال فیجیٔ الیہ الرجل فیقول یامہدی! اعطنی اعطنی! قال فیحثی لہ فی ثوبہ مااستطاع ان یحملہ۔

(۲) جناب نے فرمایا ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا.... وغیرہ۔ آپ کے ان الفاظ کی کوئی سند احادیث میں نہیں ہے۔ اگر ہو تو تحریر فرمائیں جو لوگ آپ کے برعکس خیالات رکھتے ہیں ان کی واقعاتی دلیل یہ ہے کہ اب تک جتنے مجددانِ امت گزرے ہیں وہ عموماً صوفیائے کرام کے طبقہ میں ہوئے ہیں۔

(۳) جناب کی ان سطور سے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا یہ شبہ کیا جارہا ہے کہ آپ خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔

(۴) کتاب "علاماتِ قیامت" مؤلفہ شاہ رفیع الدین صاحب ومترجمہ مولوی نور محمد صاحب) میں امام مہدی کے متعلق، مسلم وبخاری کے حوالے سے چند روایات درج ہیں لیکن تحقیق کرنے پر مسلم وبخاری میں مجھے اس قسم کی کوئی حدیث نہ مل سکی۔ اسی کتاب میں ایک روایت یہ بھی درج ہے کہ بیعتِ مہدی کے وقت آسمان سے یہ ندا آئے گی کہ "ھٰذا خلیفۃ اللہ المہدی فاستمعوا لہٗ واطیعوا" اس روایت کے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے؟

جواب :-

(۱) امام مہدی کے متعلق جو احادیث مختلف کتب حدیث میں مروی ہیں ان کے متعلق میں اپنی تحقیق کا خلاصہ اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ جو لوگ امام مہدی کے متعلق کسی روایت کو ماننے کے لیے اتنی بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں درج ہے یا تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے صرف اس مرحلہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ راویوں کے متعلق یہ معلوم کریں کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں۔ ان کے لیے یہ درست ہے کہ اپنا وہی عقیدہ رکھیں جو انھوں نے روایات میں پایا ہے۔ لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں نیز جن کے سامنے بنی فاطمہ اور بنی عباس اور بنی اُمیّہ کی کشمکش کی پوری تاریخ ہے اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس کشمکش کے فریقوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں اور راویوں میں سے بھی اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کریں۔ خود آپ نے جو احادیث نقل کی ہیں ان کے اندر بھی "رایات اسود" یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر موجود ہے اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کے شعار تھے۔ نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کر کے خلیفہ مہدی عباسی کو مہدی موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اب اگر کسی کو ان چیزوں کے ماننے پر اصرار ہے تو وہ مانے اور "تجدید و احیائے دین" میں جس رائے کا اظہار میں نے کیا ہے اس کو رد کر دے کچھ ضروری نہیں ہے کہ ہر تاریخی علمی اور فقہی مسئلہ میں میری ایک بات سب لوگوں کے لیے قابلِ تسلیم ہو اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ان مسائل میں میری کوئی تحقیق پسند نہ آئے تو اصل دین کی سعی اقامتِ دین میں بھی میرے ساتھ تعاون کرنا اس کے لیے حرام ہو جائے۔ آخر یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ علوم میں اہلِ علم کی رائیں مختلف ہوئی ہوں۔

(۲) میں نے یہ بات جو کہی ہے کہ مہدئ موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہو گا۔ اس کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈوائے گا، کوٹ پتلون پہنے گا۔ اپ ٹوڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانہ میں بھی پیدا ہوگا اس زمانہ کے علوم سے، حالات سے اور ضروریات سے، پوری طرح واقف ہوگا۔ اپنے زمانہ کے مطابق عملی تدابیر اختیار کرے گا۔ اور ان تمام آلات و وسائل سے کام لے گا جو اس کے دور میں سائنٹیفک طریقے سے دریافت ہوئے ہوں۔ یہ تو ایک صریح عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی تدابیر مثلاً خندق، دبابہ، منجنیق وغیرہ استعمال فرماتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ کسی دور میں جو شخص حضورؐ کی جانشینی کا حق ادا کرنے اٹھے گا۔ وہ ٹینک اور ہوائی جہاز سے سائنٹیفک معلومات سے اور اپنے زمانے کے احوال و معاملات سے بے تعلق ہو کر کام کرے گا۔ کسی جماعت کے حصولِ مقصد اور کسی تحریک کے غلبہ کا فطری راستہ یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو قابو میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم و فنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے۔

(۳) یہ ارشاد کہ "اس سے شبہ کیا جارہا ہے کہ تو خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کریگا"۔ اس کے جواب میں بجز اس کے میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہوسکتا جو خدا سے ڈرتا ہو۔ جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات ۱۲) جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کرکے بندگانِ خدا کو جماعتِ اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرمارہے ہیں میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہیں کرسکیں گے اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاءاللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کرکے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔

(۴) کتاب علاماتِ قیامت" میں جس روایت کا ذکر ہے اس کے متعلق میں نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ صحیح ہے اور فی الواقع حضورؐ نے یہ خبر دی ہے کہ مہدی کی بیعت کے وقت آسمان سے ندا آئے گی کہ "ھٰذا خلیفۃ اللّٰہ المھدی فاستمعوا واطیعوا" تو یقیناً میری وہ رائے غلط ہے۔ جو تجدید واحیائے دین" میں میں نے ظاہر کی ہے۔ لیکن مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ حضورؐ نے ایسی بات فرمائی ہوگی۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نبی کی آمد پر بھی آسمان سے ایسی ندا نہیں آئی خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو آخری نبی تھے اور نوع انسانی کے لیے جن کے بعد کفر وایمان کے فیصلہ کا دوسرا موقع آنے والا نہ تھا۔ آپ کی آمد پر بھی ایسی کوئی ندا آسمان سے نہیں سنی گئی مشرکین مکہ مطالبہ کرتے ہی رہے کہ آپؐ کے ساتھ کوئی فرشتہ ہونا چاہیے جو ہمیں خبردار کرے کہ آپ خدا کے نبی ہیں یا اور کوئی صریح بات ایسی ہونی چاہیے جس سے یقینی اور غیر مشتبہ طور پر ہمیں آپؐ کا نبی ہونا معلوم ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سارے مطالبوں کو رد فرما دیا۔ اور انھیں قبول نہ کرنے کی وجہ یہ بھی متعدد مقامات پر قرآن میں ظاہر کر دی۔ کہ حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینا جس سے عقلی آزمائش وامتحان کا کوئی موقع باقی نہ رہے حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کو صرف امام مہدی کے معاملہ ہی میں بدل دے گا اور ان کی بیعت کے وقت آسمان سے منادی کرائے گا کہ "لوگو یہ ہمارا خلیفۂ مہدی ہے اس کی سنو اور اطاعت کرو۔"

(ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

سوال:۔

اسلام تمام دنیا کو پیغام دیتا ہے کہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے

کے برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اسلام کے حرم میں داخل ہوتے ہی سب اونچ نیچ برابر ہو جاتی ہے اگر کوئی فرق رہتا ہے تو وہ بس اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول پر رہتا ہے پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کا مفہوم یہ یا اس کے قریب ہے کہ خلافت قریش میں رہنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے تو پھر ہٹلر ہی نے کیا برا کیا اگر اپنی قوم کو تمام دنیا کی قوموں پر فائق اور سرداری کا حق دار ٹھیرایا؟ اور پھر اگر ایک قریشی کے لیے یہ حق ہے کہ قریش کو نہ صرف عجم پر بلکہ خود اہل عرب پر بھی فوقیت دے تو آخر مغربی اقوام ہی دوسری قوموں کو کم تر ٹھیرانے میں کیوں حق بجانب نہیں۔ اسلام کی اس دعوت کو حدیث کی اس روایت کے ساتھ کیونکر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

جواب:-

بسا اوقات آدمی ایک خاص ماحول میں خاص موقع ومحل پر ایک بات کہتا ہے جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن جب وہی بات اپنے محل سے الگ کر کے نقل کی جاتی ہے تو اس کی شکل کچھ اور ہی بن جاتی ہے اور اس سے ایسے معنی نکل آتے ہیں جو خود قائل کے منشاء کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ اس معنی کی احادیث کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس غلط فہمی میں پڑ کر فقہاء اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خلافت کے لیے منجملہ اور شرائط کے قرشیت کو بھی ایک قانونی شرط قرار دے لیا۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء کچھ اور تھا۔

اصل یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف اسلام کے اصولوں کی دعوت وتبلیغ بالکل بے لاگ طریقے پر فرماتے تھے۔ تو دوسری طرف ایک بالغ النظر مدبر کی حیثیت سے وقت اور سوسائٹی اور ماحول کے واقعی حالات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور ایسی تدابیر عمل میں لانے سے پرہیز فرماتے تھے جو چاہے اصولاً اپنی جگہ صحیح ہوں مگر واقعی حالات کا لحاظ کیے بغیر ان کو عملی جامہ پہنا دینے سے عظیم تر فتنہ رونما

ہونے کا اندیشہ ہو۔ آپؐ نے اس وقت کے عرب کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا تھا اور بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ قریش کا قبیلہ اپنے مردانِ کار کی قابلیت اور اپنے ان اثرات کی بنا پر جو اسے صدیوں سے ملک میں حاصل تھے۔ اتنا طاقت ور قبیلہ ہے کہ اگر اس کی موجودگی میں آپؐ کے بعد کسی غیر قریشی کو امیر بنا دیا گیا تو وہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اسلام کی جو جمہوری روح آپؐ نے لوگوں میں پھونک دی تھی اس کی بنا پر عین ممکن تھا کہ مسلمان اس روح کا مظاہرہ کرنے کے لیے آپؐ کے بعد کسی آزاد کردہ غلام کو خلیفہ بنا لیتے یا کسی بے اثر قبیلہ کے شیخ کو منتخب کر لیتے۔ لیکن اس وقت ملک کا اجتماعی نظام عملاً جس طرح کا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت غلط تدبیر ہوتی۔ اسی وجہ سے آپؐ نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ آپؐ کا جانشین کوئی قریشی ہونا چاہیے۔

حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپؐ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی سلطنت قائم کی۔ اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا۔ اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کردی اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ ایک زبردست قابلیتوں اور اثرات کے مالک قبیلہ کی موجودگی میں اگر عملی سیاست کو نظر انداز کر کے محض نظری سیاست کا مظاہرہ کیا جاتا تو نتیجہ خلافت کی ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ قانونی حیثیت سے نہ تھا کہ ازروئے شرع خلیفہ کو قریشی ہونا چاہیے اور غیر قریشی کو خلافت کا حق ہی نہیں ہے بلکہ وہ عملی سیاست کے لحاظ سے ایک ہدایت تھی اور ساتھ ہی آپؐ نے یہ پیشین گوئی بھی کردی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علمبرداری کرتے رہیں گے اور ان میں دو آدمی بھی مردانِ کار پائے جائیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

یہ جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں۔ احادیث کے تتبع سے اس کی پوری وضاحت

ہو سکتی ہے۔

مسند احمد میں عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "قریش قادۃ الناس" "قریش اہل عرب کے لیڈر ہیں" بیہقی میں حضرت علیؓ کی روایت اس معنی پر مزید روشنی ڈالتی ہے، اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "کان ھٰذا الامر فی حمیر فنزعہ اللہ منھم وجعلہ فی قریش" "پہلے عرب کی سرداری حمیر[1] والوں کو حاصل تھی۔ پھر اللہ نے ان سے چھین کر قریش کو دے دی"۔ دوسری روایات میں اس مضمون کی اور زیادہ تشریح ملتی ہے۔ مثلاً "الناس تبع القریش فی الخیر والشر" "بھلائی ہو یا برائی دونوں راستوں میں اہل عرب قریش ہی کے پیچھے چلتے ہیں"۔ برالناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم" "اچھے لوگ قریش کے اچھوں کی اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کی پیروی کرتے ہیں"۔ "الناس تبع لقریش فی ھٰذا الشان، مسلمھم لمسلمھم وکافرھم لکافرھم" "اہل عرب سرداری قریش ہی کی مانتے ہیں مسلمان قریش کے مسلمانوں کی پیروی کرتے ہیں اور کافر قریش کے کافروں کی"۔

اسی مضمون کو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی سقیفۂ بنی ساعدہ والی تقریر میں بیان فرمایا تھا کہ "فاما العرب فلن تعرف ھٰذا الامر الا لھٰذا الحی من قریش" "اہل عرب تو قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں ہیں"۔

یہ سب کچھ بیانِ واقعہ ہے جو کچھ اس وقت عرب کے واقعی حالات تھے اور صدیوں کی تاریخ نے جو حقیقی صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ وہی ان روایات میں بیان کر دی گئی ہے ان میں کہیں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ قریش سردار ہوں بلکہ اس واقعہ کو بطور ایک واقعہ کے بیان کیا گیا ہے کہ قریش ملک کے سردار ہیں۔ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے بہت پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ ساری قوم کی نفسیات پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو میں یہ آگے تھے اور قوم ان کے پیچھے چلتی تھی۔ پھر جب کہ کفر کی طرح اسلام میں بھی یہی پیش پیش رہے اور انہی کے اثر سے اہل عرب نے اس دین کو قبول کیا تو کوئی وجہ

---

[1] حمیر یمن کا مشہور قبیلہ

نہ تھی کہ ان کی اس واقعی اور تاریخی سرداری کے خلاف جنگ کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش میں خواہ مخواہ قوت ضائع کی جاتی اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو ہدایت فرمائی کہ اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے زمانۂ اسلام میں بھی قریش کو سرداری کے مرتبہ پر قائم رہنے دو۔ قدموا قریشًا ولا تقدموھا "قریش کو آگے رکھو اور ان کے مقابلہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔"

پھر آپ نے متعدد مواقع پر اس بات کی بھی صراحت فرمادی کہ قریش اس مرتبہ پر اس وقت تک سرفراز رہیں گے جب تک ان میں سرداری کی صلاحیت رہے گی اور جب تک وہ اس دین کو قائم رکھیں گے۔

ان ھٰذا الامر فی قریش	یہ سرداری قریش میں باقی رہے گی۔
لا یعادیھم احد الا کبہ اللّٰہ	اور جو ان کا مقابلہ کرے گا اللہ اس
علی وجھہ ما اقاموا	کو منہ کے بل گرادے گا، جب تک وہ
الدین (بخاری: کتاب المناقب)	اس دین کو قائم کرتے رہیں گے۔
الائمۃ من قریش	سردار قریش ہی میں سے ہوتے
ما اذا حکموا فعدلوا	رہیں گے جب تک وہ اپنے حکم میں
و وعدوا فاوفوا واسترحموا	انصاف اور اپنے وعدوں کو وفا اور
(مسند احمد)	خلق اللہ پر رحم کرتے رہیں گے۔
لا یزال ھٰذا الامر فی قریش	یہ سرداری قریش ہی میں رہے گی
ما بقی منھم اثنان (بخاری: کتاب المناقب)	جب تک ان میں دو مردانِ کار بھی باقی رہیں گے۔

ان ارشادات میں صریح طور پر یہ بات متضمن ہے کہ جب قریش اپنی اس اہلیت کو کھودیں گے تو سرداری ان سے نکل جائے گی اور غیر قرشی بلکہ اہل عرب تک سردار و پیشوا بن جائیں گے۔ اگر اسلامی شریعت میں از روئے ضابطہ خلافت صرف قریش ہی کا حق ہوتی اور غیر قرشی کو کسی صورت میں یہ حق پہنچتا ہی نہیں تو یہ بات آخر کیسے کہی جاسکتی تھی۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاوّل ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

حضرت علیؓ کی اُمّیدواریِ خلافت؟

سوال:-

جماعت اسلامی کے ارکان بالعموم موجودہ زمانے کے جمہوری طریقوں پر جو تنقیدیں کرتے ہیں ان میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ جو شخص خود کسی منصب یا عہدے کا امیدوار ہو یا اس کا دعویدار بنے، اسلام کی رو سے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے منتخب کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ جو خلافت کے امیدوار یا دعویدار تھے ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

جواب:-

حضرت علیؓ کی امیدواری و دعویداری کا قصّہ دراصل ایک بڑے قصّے کا جزو ہے۔ جس کی بنا بعض مخصوص روایات پر قائم ہے۔ اس جزو کو کل سے الگ کر کے تنہا اسی پر بحث کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر آپ اس جزو کو مانتے ہیں تو اس پورے قصّے کو ماننا پڑے گا جس کا جزو یہ ہے اور پھر اس پر بحث کرنی ہوگی۔

اس قصّے کی روایات بہت مشہور ہیں یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سقیفۂ بنی ساعدہ کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور ابن قتیبہ اپنی الامامۃ والسیاسۃ میں جو نقشہ کھینچتا ہے اور ایسے ہی دوسرے لوگ جو روایات اس سلسلہ میں بیان کرتے ہیں وہ سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ صلعم مبلغ قرآن، داعیٔ اسلام، مزکّیٔ نفوس کی شخصیت پر ان کی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خطِ نسخ کھینچ دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر و اُحد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جھنڈا دنیا میں بلند کیا تھا اس کے اخلاق اس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی

خواہشات اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرّہ برابر بھی مختلف نہ تھے۔

اس تاریخ میں ہمارے سامنے کچھ اس طرح کا نقشہ آتا ہے کہ ایک حوصلہ مند شخص نے کئی سال کی جانفشانی سے لڑ بھڑ کر ایک ملک فتح کیا تھا اور اپنے زورِ بازو سے ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ پھر قضائے الٰہی سے اس نے وفات پائی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے رفیقوں اور ساتھیوں نے جو سب کے سب اسی کے بنائے ہوئے آدمی تھے اور جن پر وہ تمام عمر اعتماد کرتا رہا۔ یکایک آنکھیں پھیر لیں۔ ابھی اس کے گھر والے اس کی تجہیز و تکفین ہی میں مشغول تھے کہ اس کے ساتھیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ کسی طرح تختِ شاہی پر قبضہ کریں۔ چنانچہ وہ جمع ہوئے اور پہلے آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ لقمۂ تر میرے منہ میں آئے۔ آخر بڑی ردّ و کد کے بعد انھوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا یہ کارروائی جب مکمل ہو گئی تو بانیٔ سلطنت کے خاندان والوں کو اس کی خبر پہنچی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرحوم کا بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ ایک داماد تھا وہ بپھر گیا کہ میرے ہوتے اور کون وارثِ تاج و تخت ہو سکتا ہے۔ بیٹی بھی پیچ و تاب کھانے لگی —— کہ جو سلطنت اس کے باپ نے برسوں کی جانفشانی سے قائم کی تھی اس پر دوسروں کو قبضہ کر لینے کا کیا حق ہے، پہلے تو خاندان والے آپس میں سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے۔ پھر انھوں نے مرحوم بادشاہ کے پرانے پرانے ساتھیوں کو اس کے احسانات یاد دلا دلا کر اپیل کرنے شروع کیے اور پبلک میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کا داماد اس کی بیٹی کو دارالسلطنت کے محلّوں میں لیے لیے پھرتا رہا اور ایک ایک با اثر قبیلے میں اسے لے گیا تاکہ شاید اسی کی فریاد سے لوگوں کے دل پگھل جائیں۔ مرحوم بادشاہ کی قبر کو بھی خطاب کر کر کے دہائیاں دیں کہ شاید یہی اپیل کارگر ہو جائے۔ مگر کسی نے سن کر نہ دی۔ آخر بیچارہ تھک ہار کر بیٹھ رہا اور جب مرحوم کی بیٹی بھی، جو اس کے دعوے کی اصل بنیاد تھی دنیا سے رخصت ہو گئی تو اس غریب نے جا کر بادلِ ناخواستہ غاصبِ تخت کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر دل میں وہ برابر پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اپنے اس پیچ و تاب کا اظہار

بھی کسی نہ کسی طرح کرتا رہا۔

کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحابؓ کبار کی؟ کیا اللہ کے رسولؐ کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیانِ سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوئے تھے؟ آخر اس نقشے کو کیا مناسبت ہے قرآن اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے؟ محمدؐ کی زندگی سے اور آپؐ کی ان بلند ترین اخلاقی ہدایات سے جو ذخیرۂ حدیث میں بھری پڑی ہیں؟ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ان سوانح حیات سے جن میں (اس ایک قصّہ کے سوا) دنیا طلبی کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا؟ ابوبکرؓ و عمرؓ کی ان زندگیوں سے جن کا کوئی رنگ بھی دنیا کے بھوکے لوگوں کے رنگ ڈھنگ سے نہیں ملتا؟ اور صحابہؓ کرام کی ان سیرتوں سے جن کے مجموعے میں اس داستان کے کھینچے ہوئے نقشے کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسی طرف سے بھی اس کا جوڑ ان کے ساتھ بیٹھتا نظر نہیں آتا؟

پھر اگر اس گروہ کی تاریخ کا پورا مستند ذخیرہ ہمارے سامنے اس کے اخلاق اس کی سیرت، اس کی ذہنیت اور اس کی نفسیات کا کچھ اور نقشہ پیش کرتا ہے اور صرف یہ ایک مجموعۂ روایات اس کے بالکل برعکس ایک اور ہی نقشہ پیش کر رہا ہے تو آخر عقل کیا کہتی ہے؟ کیا یہ کہ سمندر میں اتفاقاً آگ لگ گئی تھی؟ یا یہ کہ سمندر میں پانی تھا ہی نہیں۔ آگ ہی آگ تھی؟ یا یہ کہ آگ لگنے کا قصّہ جھوٹا ہے، جب تمام شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ سمندر تھا تو وہاں پانی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا؟

تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصّے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا۔ قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں۔ اصل میں تو ایک شخص نے ان چالوں سے دنیا کو پھانسا تھا تاکہ اپنی ایک سلطنت بنائے اور اس قسم کے دنیا طلب جیسے لوگ مکاروں کے گرد

جمع ہوا کرتے ہیں ویسے ہی لوگ اس کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے اور تقدس کے اس ظاہری پردے میں دراصل وہ جن مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا ان کا راز آخر کار اس کے اپنے گھر والوں نے فاش کر کے رکھ دیا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!

اس کے مقابلے میں تاریخ کچھ اور روایات بھی پیش کرتی ہے ذرا ان کو بھی دیکھ لیجئے علامہ ابوجعفر ابن جریر طبری پوری سند کے ساتھ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعیدؓ بن زید سے نبی کریمؐ کی وفات کے بعد واقعات پوچھے گئے تھے اس سلسلے میں انھوں نے بیان کیا:۔

ان علی بن ابی طالب کان	علیؓ ابن ابوطالب اپنے گھر میں تھے
فی بیتہ اذجاءۃ من انباۃ	کہ ایک شخص نے ان کو جا کر خبر دی کہ
ان ابا بکر قد جلس للبیعۃ	ابوبکرؓ بیعت لینے کے لیے بیٹھے
فخرج فی قمیص لہ ما علیہ	ہیں یہ سن کر وہ چادر اور ازار کے بغیر نرے
ازار ولا رداء عجلا کراھیۃ	قمیص ہی میں نکل کھڑے ہوئے اتنی
ان یبطی عنھا حتی بایعہ ثم	دیر کرنی بھی انھوں نے پسند نہ کی کہ کپڑے
جلس الیہ وبعث الی ثوبہ فاتاہ	پہن لیں۔ پہلے جا کر بیعت کی پھر گھر
فتجللہ ولزم مجلسہ۔ (تاریخ طبری ج۲)	سے کپڑے منگائے اور پہن کر مجلس میں بیٹھے۔

بیہقی کی روایت اس سے تھوڑی مختلف ہے وہ ابوسعیدؓ خدری سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

فصعد ابوبکر المنبر فنظر	پھر ابوبکرؓ منبر پر چڑھے اور حاضرینِ مجلس
فی وجوہ القوم فلم یر الزبیر	پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ زبیرؓ موجود نہیں ہیں
قال فدعا بالزبیر فجاء فقال	ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا،
قلت ابن عمۃ رسول اللہ و	جب وہ آئے تو فرمایا میں کہہ رہا تھا
حواریہ اردت ان تشق عصا	کہ رسولؐ اللہ کے پھوپھی زاد بھائی اور
المسلمین فقال لا تثریب	حضورؐ کے حواری کہاں ہیں۔ کیا تم

یا خلیفۃ رسول اللہ فقام فبایعہ	مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا
ثم نظر فی وجوہ القوم فلم یر	چاہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا،
علیا فدعا بعلی بن ابی طالب،	اے جانشینِ رسول معاف فرمایئے
فجاء، فقال قلت ابن عم	پھر اٹھے اور بیعت کی۔ پھر ابوبکرؓ نے
رسول اللہ وختنہ علی	مجمع پر دوبارہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ
ابنتہ، اردت ان تشق	علیؓ نہیں ہیں انھیں بلانے کے لیے
عصا المسلمین؟	بھی آدمی بھیجا جب وہ آگئے تو فرمایا
قال لا تثریب یا	میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہؐ کے چچازاد
خلیفۃ رسول اللہ	بھائی اور داماد کہاں رہ گئے۔ کیا تم
فبایعہ۔	مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا
	چاہتے تھے؟ انھوں نے بھی فرمایا
	کہ اے جانشینِ رسولؐ! معاف فرمایئے۔
	پھر بیعت کی۔

ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ محض تفصیل کا فرق ہے۔ ورنہ دراصل دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ پھر اس کی مزید تائید حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو موسیٰ بن عقبہ نے عمدہ سند کے ساتھ اپنے مغازی میں نقل کی ہے۔

ثم خطب ابوبکر	پھر ابوبکرؓ نے بیعت کے بعد خطبہ دیا
واعتذر الی الناس	اور اپنی معذرت پیش کرتے ہوئے
وقال ما کنت حریصا	فرمایا: "میرے دل میں ایک دن یا ایک
علی الامارۃ یوما ولا لیلۃ	رات کے لیے بھی امارت کی ہوس
ولا سالتھا فی سر و	نہ تھی اور نہ میں نے کبھی خفیہ یا علانیہ
لا علانیۃ، فقبل المہاجرون	اس کی خواہش کی۔" سب مہاجرین

مقالتہ وقال علی والزبیر ما غضبنا الا لانا اخرنا عن المشورۃ وانا نری ابا بکر احق الناس بہا، انہ لصاحب الغار وانا لنعرف شرفہ وخیرہ ولقد امرہ رسول اللہ ان یصلی بالناس وھو حی۔	نے حضرت ابوبکرؓ کی اس تقریر کو خاموشی سے سنا۔ البتہ علیؓ اور زبیرؓ نے اتنا کہا کہ ہم کو شکایت صرف اس بات کی ہے کہ ہمیں مشورے میں شریک نہیں کیا گیا۔ ورنہ ہم بھی ابوبکرؓ کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ غار ہیں ان کے شرف اور ان کی تجربہ کاری کا ہمیں اعتراف ہے اور رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں انہی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کیا تھا۔

پھر علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں اپنی یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے پاسِ خاطر سے چھ مہینے تک خانہ نشین رہے کیونکہ وہ تقسیم میراث کے معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہوگئی تھیں، اور حضرت علیؓ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ نبی کریمؐ کی وفات سے جو داغ ان کے دل کو لگا ہے اس پر کسی ادنیٰ وجہِ ملال کا بھی اضافہ ہو۔ بعد میں جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت علیؓ نے دوبارہ حاضر ہوکر حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی تجدید کی اور معاملات میں حصہ لینا شروع کیا علامہ ابن عبد البر استیعاب میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے حوالہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ کے لیے بیعت خلافت ہو چکی تو جناب ابوسفیان حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا کہ "یہ کیا ہوا؟ قریش کے قبیلوں میں سے سب سے چھوٹے قبیلے نے تمہارے مقابلے میں اس منصب پر غلبہ پالیا؟ اے علی اگر تم چاہو تو خدا کی قسم میں اس وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں" اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا:

مازلت عدو اللاسلام	تم ساری عمر اسلام اور اہلِ اسلام کی

واهله فما ضرذالك الاسلام	دشمنی کرتے رہے مگر تمہاری دشمنی سے
واهله شيئًا ۔ انا رأينا ابا بكر	اسلام اور اہل اسلام کا کچھ نہ بگڑ سکا۔ ہم
لها اهلا ۔	ابوبکر کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔"

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرے میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کون سی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل ریجھتا ہو تو ریجھے مگر اس کے ساتھ ایک امیدواری و دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائے گا اور اگر کوئی اس دوسری تصویر کو قبول کرے تو اس میں سرے سے اس واقعہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ حضرت علیؓ منصب خلافت کے امیدوار یا دعویدار تھے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

فقہی مسائل

مہرِ غیر مؤجّل کا حکم

سوال:-

اگر بوقت نکاح زرِ مہر کی صرف تعداد مقرر کر دی گئی اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجّل ہے یا مؤجّل تو آیا اس کو معجّل قرار دیا جائے گا یا مؤجّل؟
اس مسئلہ میں علماء سے استفتاء کیا گیا مگر جوابات مختلف آئے مثلاً چند جوابات یہ ہیں۔

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب و دیگر علماء دہلی:-

"اگر مہر میں مؤجّل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بہ جہالتِ فاحشہ ہو تو مہر معجّل ہو جاتا ہے اور جب کہ معجّل یا مؤجّل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب الادا کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجّل ہوگا۔ کیونکہ بغیر ذکر اجل کے مؤجّل نہیں ہو سکتا۔ الا اذا اجہل الاجل جہالۃ فاحشۃ فیجب حالاً۔ غایۃ (درمختار)

وان کانت جہالۃ متفاحشۃ کالی المیسرۃ او الی ھبوب الریح او الی ان تمطر السماء فالاجل لا یثبت ویجب المہر حالاً۔ وکذا فی غایۃ البیان (در مختار)"

مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر ضلع اعظم گڑھ۔

"مہر مؤجّل اس وقت ہوگا جب بوقت عقد نکاح ادائے مہر کے لیے وقت اور تاریخ کی تعیین ہو، ورنہ معجّل، یہی حال تمام معاملات کا ہے"

اگر کسی نے ایک دوکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں نقد یا تاخیر تعیین وقت کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجّل کے حکم میں ہوگا۔ خریدار خواہ فوراً قیمت دیدے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے۔ بہرصورت معجل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فوراً ادا کیا جائے۔ بلکہ صاحب حق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ فوراً یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور معاملہ موجّلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبہ اور تقاضے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس کی تفصیل کی رو سے معاملہ مسئولہ میں زر مہر معجّل ہے اس لیے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ اور دعویٰ کر سکتی ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی:۔

"زر مہر میں اگر معجّل یا مؤجّل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ وقایہ میں ہے۔ والمعجل والموجل ان بینا فذالك والا فالمتعارف۔ اگر معجّل اور مؤجّل دونوں بیان کر دیے گئے ہیں تو جیسا بیان کیا گیا ہے ویسا ہوگا۔ ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا۔"

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نائب مفتی ریاست پٹیالہ و دیگر علماء:۔

"اس صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ وہی مختصر وقایہ کا ہے) اگر عرف یہ ہے کہ ایک عورت ایسے غیر مبیّن مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کر سکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔" اس اختلاف کا حل کیا ہے۔ براہ کرم آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب:۔

قرآن اور حدیث کی رو سے مہر دراصل اس حقِ زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں تمہارے

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء: ۲۴)	لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض ان سے طلبِ نکاح کرو۔
فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء: ۲۴)	پس جو لطف تم نے ان سے اٹھایا ہے۔ اس کے بدلے ان کے مہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔
وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (النساء: ۲۱)	اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جبکہ تم میں سے ایک دوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں پھر اس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں صحاح ستہ اور دارمی اور مسند احمد میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے:۔

اَحَقُّ الشُّرُوْطِ اَنْ تُوْفُوْا بِهٖ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهٖ الْفُرُوْجَ۔	تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

لعان کا وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے، آپ نے جواب میں فرمایا:۔

لامال لك ان كنت صدقت عليها فهو بما استحللت من فرجها وان كنت	مال لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اس کے معاوضہ میں وہ

كذبت عليها فذالك	مال ادا ہو چکا اور اگر تو نے اس پر جھوٹا
ابعد لك منها۔	الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ
(مسلم ، کتاب اللعان)	سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔

اس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ :۔

من تزوج امرأة بصداق	جس نے کسی عورت سے نکاح کیا
ونوى ان لا يوديه فهو	اور نیت یہ رکھی کہ یہ مہر دینا نہیں ہے
زان۔	وہ زانی ہے۔

ان تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمائشی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضہ میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے اور ان نصوص کا اقتضاء یہ ہے کہ استحلال فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے اِلّا یہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر کر دینے کے لیے کوئی قرارداد ہو چکی ہو۔

پس زر مہر کی ادائیگی کے معاملے میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استحلال فرج کے ساتھ بروقت ادا ہو اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرارداد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی تعجیل) کا کیا جائے گا۔ نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرح ہونے کی صورت میں زر مہر کو آپ سے آپ مؤجل ٹھیرایا جائے۔

فقہائے حنفیہ کے درمیان اس مسئلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ غایۃ البیان میں ہے :۔

فان كان بشرط التعجيل	اگر مہر بشرط تعجیل ہو یا اس کے بارے

او مسکوتا عنه یجب حالا ولها ان تمنع نفسها حتیٰ یعطیها المهر	میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجّل ہے یا مؤجّل) تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک لے جب تک کہ وہ مہر ادا نہ کرے۔

اور شرح العنایہ علی الہدایہ میں ہے:۔

فان سمعوا المهر ساکتين عن التعجيل والتاجيل ماذا يكون حكمه؟ قلت يجب حالا فيكون حكمه حكم ما شرط تعجيله،	پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجّل یا مؤجّل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا۔ اس کا حکم اس مہر کا سا حکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیجابی میں ہے:۔

ان كان المهر معجلا او مسكوتا عنه فانه يجب حالا لان النكاح عقد معاوضة وقد تعين حقه في الزوجة فوجب ان يتعين حقها وذالك بالتسليم۔	اگر مہر معجّل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو وہ فوراً واجب ہوگا کیونکہ نکاح ایک عقد باِمعاوضہ ہے جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین ہو گیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر ادا کر دیا جائے۔

رہا دوسرا گروہ، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:۔

فان لم يبينوا قدر المعجل ينظر الى المرأة والى المهر	اگر معجّل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقہ کی

انه کم یکون المعجل	ہے اور مہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت
لمثل هٰذه المرأة من مثل	کے لیے ایسے مہر میں سے کس قدر
هٰذه المهر فیعجل ذٰلك	معجل قرار دیا جاتا ہے بس اتنی ہی مقدار
ولا یتقدر بالربع والخمس	معجل قرار دی جائے ایک چوتھائی یا
بل یعتبر المتعارف۔	پانچواں حصہ کی تعیین نہ کردینی چاہئے بلکہ
	جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

وان لم یشترط تعجیل	اور اگر کسی حصہ مہر کی تعجیل کی شرط نہ
شئ بل سکتوا عن	کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل کے بارے
تاجیله وتعجیله کان	میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج
عرف فی تعجیل بعضه	کو دیکھا جائے گا اگر رواج یہ ہے کہ
وتاخیر باقیه الی الموت	ایک حصہ معجل قرار دیا جاتا ہے اور
او المیسرة او الطلاق فلیس	باقی حصہ موت تک یا خوشحالی تک
لها ان تحتبس الا الی	یا طلاق تک مؤخر رکھا جاتا ہے تو
تسلیم ذالك القدر۔	عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول
	ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے
	روکنے کا حق رکھتی ہے۔

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن وحدیث کے منشاء سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے، ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاجیل اصل ہے اور جب تاجیل وتعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام

طور پر مروّج ہو اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک بے لکھے معاہدے کی سی ہوتی ہے۔ اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بصراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پہلو میں وہ مروجہ طریقہ پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلم ہے اور اس لحاظ سے فقہاء کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطور ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) کے تسلیم نہیں کیا ہے۔ کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور اس کے غیر منصفانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو بے لکھا معاہدہ مان کر مثل قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اس کے رواج شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کی پیروی میں پیدا ہوئے ہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثلِ قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے ملک کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقات زن و شوہر کے معاملہ میں اس نے خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کر کے اس کے توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح اور اس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملہ کو لے لیجئے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس ملک کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں اس کو دی گئی ہے نکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصور ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ

اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے" گویا یہ فعل محض ضابطہ کی خانہ پُری کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فی صدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زرِ مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پر حلال کرتے ہیں وہ مہر کو استحلال فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پر حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں اس کے عرف و رواج کو ازروئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جن فقہاء کی عبارتیں اعتبار عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں ان کے پیشِ نظر نہ یہ بگڑی ہوئی سوسائٹی تھی اور نہ اس کے خلافِ شریعت رواج۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شدہ سوسائٹی اور اس کے عرف کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصول شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات میں انھوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں ان سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج انھیں چسپاں کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۲ھ، جولائی اگست ۴۳ء)

بندوق کے شکار کی حلت و حرمت

سوال:-

آپ نے تفہیم القرآن میں تکبیر پڑھ کر چھوڑی ہوئی بندوق کے مرے ہوئے شکار کو حلال لکھ کر ایک نئی بات کا اختراع کیا[1] ہے۔ جس پر مندرجہ ذیل سوالات اٹھ رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

1۔ چاروں امام متفق ہیں کہ بندوق سے مرا ہوا شکار بوجہ چوٹ سے مرنے کے ناجائز اور حرام ہے۔ پھر آپ نے کن دلائل کی بنا پر اس کو جائز لکھا ہے۔

2۔ بندوق کی گولی میں دھار نہیں ہوتی بلکہ اس کی ضرب شدید سے جانور مرتا ہے۔ کارتوسوں پر عام طور پر لکھا ہوتا ہے کہ اس کی طاقت اتنے پونڈ ہے' یہ نہیں ہوتا کہ اس کی دھار اتنی تیز ہے۔ ضرب سے مرا ہوا شکار قطعی ناجائز ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔

3۔ تفسیر حقانی میں لکھا ہے کہ قاضی شوکانی نے بندوق کے مارے ہوئے کے حرام ہونے میں اختلاف کیا ہے لیکن قاضی صاحب کا اختلاف حجت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ مجروح احادیث بیان کرنے والا ہونے کے علاوہ اہل تشیع کی طرف میلان رکھتا ہے۔

4۔ اس مسئلہ کو فروع کہنا عوام کو دھوکا دینا ہے کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع

---

[1] واضح رہے کہ تفہیم القرآن کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے جب رسالہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہو رہی تھی۔ اس وقت یہ مسئلہ لکھا گیا تھا اور اسی پر یہ سوال ہمارے پاس آیا تھا۔ اب نظر ثانی کے بعد اس میں سے یہ مسئلہ نکال دیا گیا ہے نہ اس لیے کہ اس معاملہ میں میری رائے بدل گئی ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہاں تفصیلی دلائل کا موقع نہیں تھا اور دلائل کے بغیر محض رائے درج کر دینے سے خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

ہی رہے گا۔"

جواب:-

سب سے پہلے میں آپ کی اس غلط فہمی کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ کے سوال نمبر ۴ میں پائی جاتی ہے آپ پوچھتے ہیں "کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع ہی رہے گا؟" اس سلسلہ میں آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک حرام و حلال تو وہ ہے جو نص صریح میں حلال یا حرام قرار دیا گیا ہو اور وہ اصولی چیز ہے جس میں ردّوبدل کرنا موجب کفر ہو جاتا ہے۔ دوسرا حلال و حرام وہ ہے جو نصوص کی دلالتوں یا اشارات یا اقتضاآت سے استنباط کیا جائے۔ یہ فروعی چیز ہے اور اس میں ہمیشہ سے علماء و فقہائے امت، حتیٰ کہ صحابہ اور تابعین کے درمیان بھی اختلافات رہے ہیں۔ ایک ہی چیز کو کسی نے حلال قرار دیا ہے اور کسی نے حرام اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نوع کی استنباطی تحلیل و تحریم پر بحث و کلام سے آگے بڑھ کر کسی نے دوسرے کو یہ الزام دیا ہو کہ تمہارا دین بدل گیا ہے۔ یا تم خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال کر رہے ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اب ہمارے ملک ہی میں نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں میں ایک مدت سے شرعی مسائل کی آزادانہ تحقیق کا سلسلہ بند ہے اور ہر گروہ کسی ایک مذہب فقہی کی پابندی میں اس قدر جامد ہو گیا ہے کہ اپنے ہی مذہب خاص کو اصل شریعت سمجھنے لگا ہے۔ اس لیے جب لوگوں کے سامنے ان کے مانوس مسلک سے ہٹ کر کوئی تحقیق آتی ہے تو وہ اس پر اس طرح ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ گویا دین میں کوئی تحریف کی گئی ہے۔ حالانکہ سلف میں جبکہ آزادانہ تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ علماء کے درمیان حلال و حرام اور فرض و غیر فرض تک کے اختلافات ہو جاتے تھے اور ان کو نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ ہر گروہ اپنے نزدیک جو حکم شرعی سمجھتا تھا اس پر خود عمل کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی یہ حق دیتا تھا کہ ان کے نزدیک جو حکم شرعی ہو اس پر وہ عمل کریں۔

اسی کھانے پینے کے مسئلہ میں علماء سلف کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں ان کی چند مثالیں میں یہاں نقل کرتا ہوں اور آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ان حضرات

میں سے کس کو آپ حرام کے حلال یا حلال کے حرام کر دینے کا الزام دے سکتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ درندوں کے گوشت اور اس کے خون کے استعمال میں جو رگوں کے اوپر کے حصّے میں رہ جاتا ہے مضائقہ نہیں سمجھتی تھیں اور ان کا استدلال اس آیت سے تھا کہ :۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ (الانعام: ۱۴۵)

اور اسی آیت کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی ان چار چیزوں کے سوا جن کو قرآن مجید میں حرام کیا گیا ہے۔ (یعنی سُور، مردار، بہتا ہوا خون اور مَآ اُحِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ) اور کسی چیز کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔ ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص جلد سوم صفحہ ۲۰)

پالتو گدھے کے گوشت کے متعلق ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر بعض خاص وجوہ سے اس کے کھانے سے منع کیا تھا اور یہ ممانعت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ گدھے کا گوشت مطلقاً حرام ہے (ایضاً صفحہ ۲۱)

درندوں اور شکاری پرندوں کے معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب مطلق حرمت کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ درندوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ مگر شکاری پرندوں مثلاً کرگس، عقاب، گدھ وغیرہ کو حلال قرار دیتے ہیں، خواہ وہ مردار کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں۔ امام اوزاعیؒ صرف گدھ کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ باقی ہر قسم کے پرندے ان کے ہاں حلال ہیں۔ لیث بلی کو حلال سمجھتے ہیں اور بجو کو مکروہ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وہ درندے جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، یا وہ شکاری پرندے جو انسان کے پالتو جانوروں پر حملہ کرتے ہیں حرام ہیں۔ بجو اور لومڑی اس تعریف میں نہیں آتے۔ عکرمہ سے کوّے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ "موٹی مرغی ہے" اور بجو کے متعلق پوچھا گیا تو کہا کہ "موٹی دنبی ہے"۔ (ایضاً صفحہ ۲۲)

اسی طرح حشرات الارض کے بارے میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حنفیہ تمام حشرات الارض کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ ابن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ سانپ کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر وہ اس کے ساتھ ذکات (یعنی ذبح) کی شرط لگاتے ہیں۔ یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے اور امام اوزاعیؒ ذکات کی شرط کو بھی اڑا دیتے ہیں۔ لیث کے نزدیک خار پشت جائز ہے۔ امام

مالکؒ کے نزدیک مینڈک جائز ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جن چیزوں سے اہل عرب گھن کھاتے تھے بس وہی خبائث ہیں چنانچہ اہل عرب بجّو اور لومڑی کھاتے تھے اس لیے یہ دونوں حلال ہیں۔ (ایضاً صد ۲۴)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں نص صریح موجود نہ ہو وہاں استنباط کی بنا پر حلال وحرام کے اختلافات سب فروعی اختلافات ہیں کسی مسلک فقہی میں برنائے اجتہاد کسی چیز کا حرام ہونا ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ اصل شریعتِ الٰہی میں حرام ہے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو اپنے استنباط کی بنا پر حلال قرار دے تو اس پر بحث تو ضرور کی جاسکتی ہے لیکن یہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ اس پر رونگٹے کھڑے ہونے لگیں اور تحریفِ دین یا تحلیل مَاحَرَّمَ اللّٰہُ کے الزامات عائد کیے جانے لگیں۔

اب میں اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر آپ نے یہ سوالات کیے ہیں۔

مجھے حیرت ہے کہ یہ بات آپ نے کہاں سے معلوم کر کے لکھی ہے کہ بندوق سے مرے ہوئے شکار کے حرام ہونے پر چاروں امام متفق ہیں۔ کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی کے زمانے میں بندوق ایجاد ہوگئی تھی؟ ائمہ اربعہ کے مقلد علماء میں سے کسی گروہ کا یا سب کا ان کے استنباطی مسائل میں سے کسی مسئلہ سے تخریج کرتے ہوئے کوئی حکم نکالنا اور چیز ہے اور خود ائمہ کا کوئی حکم بیان کرنا اور چیز، بندوق بہرحال فقہائے متاخرین کے زمانہ میں ایجاد ہوئی تھی اور اس کی ساخت میں تازہ ترین اصولی تغیر تو انیسویں صدی میں ہوا ہے، اس کے متعلق اگر کوئی حکم فقہاء نے بیان کیا بھی ہے تو وہ ائمہ سلف کے اجتہادی احکام سے تفریع در تفریع کرتے ہوئے ہی بیان کیا ہوگا۔ اس کی بنیاد پر آخر خواہ مخواہ یہ دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی حرمت پر ائمہ اربعہ متفق ہیں۔

میں نے بندوق کے شکار کے حلال ہونے کا مسئلہ جو بیان کیا ہے۔ وہ قاضی شوکانی سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ براہِ راست کتاب وسنت سے اخذ کیا ہوا ہے۔ شریعت میں جانوروں کی ذکات (یعنی شرعی طریقہ سے ان کے ذبح) کے جو احکام ہیں ان کو اصولاً دو حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے:۔

ایک قسم کے جانور وہ جو ہمارے قابو میں ہوں اور جن کو ہم مقرر طریقہ کے مطابق ذبح کر سکتے ہوں۔ ان کی شرط ذکات اور ہے اور اسے اصطلاحاً ذکات اختیاری کہا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جو ہمارے قابو میں نہ ہوں۔ مثلاً جنگلی جانور یا وہ اہلی جانور جو بھاگ نکلا ہو اور وحشی کے حکم میں آگیا ہو۔ یا وہ جانور جو کہیں گر پڑا ہو اور جس کی شرط ذکات مقرر طریقہ پر ادا نہ کی جا سکتی ہو۔ یا وہ جانور جو کسی وجہ سے مرنے کے قریب ہو اور ذبح کے لیے چھری تلاش کرتے کرتے اس کے مر جانے کا امکان ہو۔ ایسے تمام جانوروں کی شرط ذکات دوسری ہے اور اسے اصطلاحاً ہم ذکاتِ اضطراری کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم کے جانوروں کا مقامِ ذبح حلق ہے اور ان کو ذبح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی تیز دھار والے آلہ سے ان کے حلقوم کو اس حد تک کاٹا جائے کہ نرخرہ اور رگِ گلو کھل جائے۔

رہے دوسری قسم کے جانور تو ان کا سارا جسم مقامِ ذبح ہے اور کسی چیز سے خواہ وہ کوئی ہو۔ ان کے جسم میں اتنا خرق (PUNCTURE) کر دینا کافی ہے کہ خون بہ جائے۔ اس سلسلہ میں جو نصوص کتاب و سنت سے ہمیں ملتی ہیں وہ ترتیب وار درج ذیل ہیں:۔

(۱) اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (المائدہ:۴)	حلال کر دی گئیں تمہارے لیے ساری پاک چیزیں اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو، جن کو تم خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو۔ وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو تم کھا لو اور اس پر اللہ کا نام لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری جانور کو اگر خدا کا نام لے کر چھوڑا گیا ہو تو اس کے پنجوں اور کچلیوں سے جو زخم وحشی جانور کو لگ جاتا ہے اور جو خون اس طرح نکل جاتا ہے اس سے "اضطراری ذکات" کی شرط پوری ہو جاتی ہے اور اگر ایسا

جانور زندہ نہ ملے اور اسے باقاعدہ ذبح نہ کیا جا سکا ہو تب بھی وہ حلال ہے۔

(۲) حضرت عدیؓ بن حاتم نے نبیؐ سے پوچھا کہ ہم معراض پھینک کر شکار کرتے ہیں حضورؐ نے جواب دیا۔ "کل ما خرق۔ وما اصاب بعرضہ فقتل فانہ وقیذ فلا تاکلہ"۔ (متفق علیہ) یعنی وہ اگر چھید دے تو کھالو۔ لیکن اگر معراض اپنے عرض کی طرف سے جانور کو لگی ہو اور اس سے وہ مر گیا تو وہ چوٹ کھایا ہوا جانور (موقوذہ) ہے اسے نہ کھاؤ۔

معراض ایک بھاری لکڑی یا عصا کو کہتے ہیں جس کے سرے پر یا تو لوہے کی انی لگی ہوئی ہو یا ویسے ہی لکڑی کو نوکدار بنا دیا گیا ہو اس کی چوٹ سے جسم کے کسی حصہ کا اس حد تک پھٹ جانا یا چھد جانا کہ اس سے خون بہہ جائے۔ شرط ذکات پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۳) رافعؓ بن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ کل دشمن سے ہمارا مقابلہ ہے اور ہمارے ساتھ چھریاں نہیں ہیں کہ ہم جانوروں کو ذبح کر سکیں تو کیا ہم پھٹے ہوئے بانس کی کھپچی سے ذبح کر سکتے ہیں؟

حضورؐ نے فرمایا:۔

ما انہر الدم واذکر اسم اللہ فکل، لیس السن والظفر"۔ (متفق علیہ)

یعنی خدا کا نام لے کر جس چیز سے بھی خون بہا دیا جائے ایسے جانور کو کھالو، البتہ دانتوں اور ناخنوں سے یہ کام نہ لیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جا رہا ہو، بلکہ شرط ذکات پوری کرنے میں صرف یہ بات معتبر ہے کہ خون بہا دیا جائے، اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم نے پوچھا "یا رسولؐ اللہ! اگر ہم میں سے کسی شخص کو شکار مل جائے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ پتھر کی دھار یا پھٹی ہوئی لکڑی سے ذبح کر سکتا ہے؟

حضورؐ نے فرمایا:۔

انہر الدم بما شئت واذکر اسم اللہ۔ (سنن نسائی: کتاب الضحایا)

"یعنی خون بہادو جس چیز سے چاہو اور اللہ کا نام لو۔"

(۴) ابوالعشراء اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عرض کیا "یارسولؐ اللہ! کیا ذبح کا مقام صرف حلق اور لبلبہ ہی نہیں ہے"؟ آپؐ نے فرمایا:-

"لوطعنت فی فخذھا لاجزا عنک"۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

"یعنی اگر تو اس کی ران میں بھی چبھو دے تو کافی ہے۔"

ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ ایسے جانور کی ذکات ہے جو کسی گڑھے وغیرہ میں گر گیا ہو ترمذی کہتے ہیں تمام ضرورت کے موقعوں کے لیے یہی ذکات ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو جانور ہمارے قابو میں نہیں ہے اس کے جسم کا ہر حصہ مقام ذبح ہے نیز یہ کہ اصل شے وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جائے۔ بلکہ صرف جسم کو چھید دینا ہے تاکہ خون بہہ جائے۔

(۵) کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ہماری بکریاں مقام سلع میں چر رہی تھیں یکایک ہماری لونڈی نے دیکھا کہ ایک بکری مرنے کے قریب ہے اس نے فوراً ایک پتھر توڑا اور اسے ذبح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کی اجازت دی۔ (بخاری)

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ بنی حارثہ میں سے ایک شخص احد کے قریب گھاٹی میں ایک اونٹنی چرا رہا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ اونٹنی مر رہی ہے مگر اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے وہ ذبح کر سکتا۔ آخر اس نے خیمہ گاڑنے کی ایک میخ لی اور اسے اونٹنی کے لبلبے میں چبھو دیا۔ یہاں تک کہ اس کا خون بہہ گیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی اور آپؐ نے اسے کھا لینے کی اجازت دے دی۔ (ابوداؤد، مؤطا)

ٹوٹے ہوئے پتھر کی دھار تو پھر بھی دھار کی تعریف میں آتی ہے۔ لیکن لکڑی کی نوکدار میخ کو دھار دار آلے کی تعریف میں جس حد تک لایا جا سکتا ہے ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا نصوص کو سامنے رکھنے کے بعد بندوق کے مسئلہ پر غور کیجیے بندوق کی گولی کو غلیل کے ٹھنڈے غلّے پر قیاس کرنا اور اس کی بنا پر یہ سمجھنا کہ اس سے جو جانور مرتا ہے وہ دراصل اس طرح کی چوٹ کھا کر مرتا ہے جیسی پتھر یا لکڑی کے عرض سے لگتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ گولی جس قوت سے بندوق سے نکلتی ہے اور پھر جس تیز رفتار کے ساتھ وہ بندوق

سے نشانہ تک (تقریباً ۵۰۰ گز فی سیکنڈ) راستہ طے کرتی ہے اس کی بنا پر وہ کوئی ٹھنڈا سنگریزہ نہیں رہتی۔ بلکہ اچھی خاصی نرم اور تقریباً نوکدار ہو کر جسم کو چھیدتی ہوئی اس میں گھستی ہے اور پھر اس سے خون بہہ کر جانور مرتا ہے۔ یہ عمل شکاری جانور کے ناخنوں اور کچلیوں اور معراض یا لکڑی کی میخ کا سرا چبھنے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ بلکہ خون بہانے میں بعید نہیں کہ ان سے زیادہ ہی کارگر ہو۔

ان وجوہ سے میری رائے میں اگر خدا کا نام لے کر بندوق چلائی جائے اور اس کی گولی یا چھرّے سے جانور مر جائے تو اس کے حلال نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا اس پر اطمینان نہ ہو اور وہ اس کو حرام ہی سمجھتا ہو تو مجھے اس پر بھی اصرار نہیں ہے کہ وہ ضرور اسے حلال مانے اور واجب ہے کہ اسے کھائے۔ میرا اجتہاد میرے لیے قابل عمل ہے اور دوسروں کا اجتہاد یا کسی مجتہد کا اتباع ان کے لیے اس اجتہادی اختلاف سے اگرچہ میرے اور ان کے درمیان حرام و حلال کا اختلاف ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود دونوں فریق ایک ہی دین میں رہتے ہیں الگ الگ دینوں کے پیرو نہیں ہو جاتے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۶۵ھ، فروری ۴۶ء)

نظامِ کفر و فسق میں کسبِ معاش کی مشکل

سوال:۔

آپ کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد میں اپنے موجودہ ذریعۂ معاش سے بیزار ہو رہا ہوں۔ لیکن کافرانہ نظامِ حکومت کے ماتحت کسب حلال قریباً ناممکن التصور ہے۔ ملازمت کاشتکاری اور تجارت سب پیشوں میں حرام داخل ہو گیا ہے۔ پھر ہمارے لیے کون سا راستہ ہے؟

جواب:۔

آپ کا کہنا بجا ہے کہ ایک کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست کے اندر رہتے ہوئے خالص

حلال کی روٹی تقریباً محال ہے۔ مگر میں نے وسائلِ رزق کے معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز پر اپنے مضامین میں بار بار جو زور دیا ہے، اس سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ حلال ذرائع یہیں کہیں موجود ہیں۔ لوگ حرام ذرائع کو چھوڑ کر ان کو حاصل کریں بلکہ اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو جانے کے بعد ایک سچا مسلمان جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے گا تب اس کو صحیح اندازہ ہو گا کہ اس کفر کے تسلط کی بدولت وہ کس طرح چاروں طرف سے گندگیوں اور نجاستوں میں گھر گیا ہے۔ پھر اگر واقعی وہ پاکیزگی کا خواہاں ہو تو اس کے اندر اس نجاست خیز نظام کو مٹانے اور بدلنے کا شدید جذبہ پیدا ہو گا اور وہ ہر آن اس نظام سے سخت نفرت و کراہت کرے گا۔

اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے اگر کچھ ممکن ہے تو صرف یہ کہ زیادہ حرام کو چھوڑ کر کم حرام یا ملوّث بہ حرام رزق کو مجبوراً گوارہ کریں۔ خالص حلال کی قید کے ساتھ زندگی کا سامان بہم پہونچنا اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ آپ کے حالات پر اور آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ عملاً کون سے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں جن میں حرام کی آمیزش کم سے کم ہو اور آپ موجودہ کافرانہ نظام کے بقاء و استحکام میں کم سے کم مددگار بنیں۔ عملاً اس میں کامیابی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معیارِ زندگی کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو چکی ہے، یہ شرط لگاتے ہیں کہ حلال تو ملے، مگر زندگی کا معیار وہی رہے جو حرام خوری کے زمانہ میں ہم نے اختیار کیا تھا۔ یہ شرط انھیں مجبوراً اسی حرام خوری میں مبتلا رکھتی ہے۔ حلال خوری پر آدمی قائم اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس امر کا فیصلہ کر لے کہ کھانا بہر حال حلال ہے قطع نظر اس سے کہ وہ پلاؤ ہو یا چٹنی۔ پہننا بہر حال حلال ہے۔ خواہ وہ نفیس کپڑے ہوں یا ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا گاڑھا۔

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۶۲ھ ستمبر اکتوبر ۴۳ء)

رشوت و خیانت کو حلال کرنے کے بہانے

سوال :-

"سرکاری اہل کاروں کو جو نذرانے اور ہدیے اور تحفے ان کی طلب اور جبر و اکراہ کے بغیر کاروباری لوگ اپنی خوشی سے دیتے ہیں۔ انھیں ملازمت پیشہ حضرات بالعموم جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رشوت کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس لیے یہ حلال ہونا چاہیے۔ اسی طرح یہ سرکاری ملازموں کے تصرف میں جو سرکاری مال ہوتا ہے اسے بھی اپنی ذاتی ضرورتوں میں استعمال کرنا یہ لوگ جائز سمجھتے ہیں۔ میں اپنے حلقۂ ملاقات میں اس گروہ کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر میری باتوں سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔"

جواب :-

ایک شخص یا اشخاص سے دوسرے شخص یا اشخاص کی طرف مال کی ملکیت منتقل ہونے کی جائز صورتیں صرف چار ہیں۔ ایک یہ کہ ہبہ یا عطیہ ہو برضا و رغبت، دوسرے یہ کہ خرید و فروخت ہو آپس میں رضامندی سے، تیسرے یہ کہ خدمت کا معاوضہ ہو باہمی قرارداد سے، چوتھے یہ کہ میراث ہو، جو ازروئے قانون ایک دوسرے سے پہنچے۔ ان کے ماسوا جتنی صورتیں انتقالِ ملکیت کی ہیں سب حرام ہیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ جو روپیہ ایک افسر یا اہل کار کسی صاحبِ غرض سے لیتا ہے یا جو استفادہ وہ اس مال سے کرتا ہے جو دراصل پبلک کا مال ہے اور پبلک کاموں کے لیے اس کے تصرف میں دیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خرید و فروخت اور میراث کی تعریف میں تو آتا نہیں پھر کیا وہ ہبہ یا عطیہ ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک سوال کا جواب کافی ہے۔ کیا یہ ہبہ یا عطیہ اہل کار کو اس صورت میں بھی ملتا جب کہ وہ اس منصب پر نہ ہوتا، یا پنشن پر الگ ہو چکا تھا، اگر نہیں تو یہ عطیہ یا ہبہ نہیں ہے کیوں کہ یہ اس کے منصب کی وجہ سے اس کے پاس آ رہا ہے نہ کہ کسی ذاتی تعلق یا محبت یا ہمدردی کی بنا پر۔ اب کیا یہ

ان خدمات کا معاوضہ ہے جو ایک اہل کار اپنے منصب کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ درحقیقت معاوضہ بھی نہیں ہے معاوضہ تو صرف وہ تنخواہ اور الاؤنس ہیں جو ملازم ہونے کی حیثیت سے آدمی کو ملتے ہیں۔ ان کے ماسوا جو کچھ ایک اہل کار اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے سلسلہ میں حاصل کرتا ہے وہ تو خیانت ہے جو پبلک فنڈ میں سے کی جاتی ہے یا ناجائز خدمات کا معاوضہ ہے جو شرائط ملازمت کے خلاف عمل کرنے کے بدلہ میں آدمی کو ملتا ہے۔ یا جائز خدمات کا ناجائز معاوضہ ہے کیونکہ شرائط ملازمت کے حدود میں رہتے ہوئے کام کرنے کا معاوضہ تو بشکل تنخواہ آدمی پہلے ہی لے چکا ہے، اس پر پھر مزید معاوضہ حاصل کرنا صریح طور پر حرام خوری ہے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب دیکھئے کہ اس معاملہ میں شرعی احکام کیا ہیں:۔

عن ابی حمید الساعدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدایا العمال غلول۔ (مسند احمد)	ابو حمید الساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سرکاری ملازمین جو ہدیے وصول کرتے ہیں یہ خیانت ہے۔
وعنہ، قال استعمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلا علی الازد یقال لہ ابن اللتبیہ، فلما قدم قال ھٰذا لکم وھٰذا اھدی لی فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فحمد اللہ واثنی علیہ ثم قال اما بعد فانی استعمل الرجل منکم علی العمل مما ولانی اللہ فیقول	انہی ابو حمید کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے ابن اللتبیہ نامی ایک شخص کو قبیلہ ازد پر عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ وہاں سے سرکاری مال لے کر پلٹا تو بیت المال میں داخل کرتے وقت اس نے کہا کہ یہ تو ہے سرکاری مال اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اس پر حضورؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا "میں تم میں سے ایک شخص کو اس حکومت کے کام

ھٰذا لکم وھٰذا ھدیۃ اھدیت لی، افلا جلس فی بیت ابیہ وامہ حتی تاتیہ ھدیتہ ان کان صادقاً۔	میں جو اللہ نے میرے سپرد کی ہے عامل بنا کر بھیجتا ہوں تو وہ آکر مجھ سے کہتا ہے کہ یہ تو ہے سرکاری مال اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے اگر یہ سچ ہے کہ لوگ اسے خود ہدیے دیتے ہیں تو کیوں نہ وہ اپنے ابا اور اپنی اماں کے گھر بیٹھا رہا کہ اس کے ہدیے اسے وہیں پہنچتے رہتے۔
بخاری، مسلم، ابوداؤد	
عن بریدۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من استعملناہ علی عمل فرزقناہ رزقا فما اخذ بعد فھو غلول	بریدہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو ہم کسی سرکاری خدمت پر مقرر کریں اور اسے اس کام کی تنخواہ دیں۔ وہ اگر اس تنخواہ کے بعد اور کچھ وصول کرے تو یہ خیانت ہے۔
(ابوداؤد)	
عن رویفع بن ثابت الانصاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یرکب دابۃ من فیٔ المسلمین حتی اذا اعجفھا ردھا فیہ ومن کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یلبس	رویفع بن ثابت انصاری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یہ حرکت نہ کرے کہ مسلمانوں کے فئے (یعنی پبلک کے مال) میں سے ایک جانور کی سواری لیتا رہے اور جب وہ بیکار ہو جائے تو اسے پھر سرکاری اصطبل میں داخل کر دے اور جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان

ثوبا من فئ المسلمین حتی اذا اخلقه رده فیه (ابوداؤد)	رکھتا ہو اس کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے فئے میں سے ایک کپڑا برتے اور جب وہ پرانا ہو جائے تو اسے واپس کردے۔
عن عبد اللہ بن عمر قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الراشی والمرتشی (ابوداؤد)	عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔
عن عدی بن عمیرة الکندی ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال یا ایها الناس من عمل منکم لنا عملا فکتمنا منه مخیطا فما فوقه فهو غل یاتی به یوم القیٰمة۔ (ابوداؤد)	عدی بن عمیرۃ الکندی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگو! جو شخص ہماری حکومت میں کسی خدمت پر مقرر کیا گیا اور اس نے ایک تاگا یا اس سے بھی حقیر تر کوئی چیز ہم سے چھپا کر استعمال کی تو یہ خیانت ہے جس کا بوجھ اٹھائے ہوئے وہ قیامت کے روز حاضر ہوگا۔

یہ ہیں اس مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، اور یہ اپنے مدعا میں اتنے واضح ہیں کہ ان پر کسی تشریح و توضیح کے اضافے کی ضرورت نہیں جو لوگ اپنی حرام خوری کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے پیش کرتے ہیں اور اسے اپنی زبانی چال بازیوں کے ذریعہ حلال بنانے کی کوشش کرتے ہیں آپ ان سے کہیے کہ اگر حرام کھاتے ہو تو کم از کم اسے حرام تو سمجھو، شاید کبھی اللہ اس سے بچنے کی توفیق دیدے۔ لیکن حرام کو حلال بنا کر کھایا تو تمہارے ضمیر مردہ ہو جائیں گے۔ پھر کبھی حرام سے بچنے کی خواہش دل میں پیدا ہی نہ ہو سکے گی اور جب خدا کے ہاں حساب دینے کھڑے ہو گے

تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت تمہارے بدلنے سے نہیں بدل سکتی۔ حرام حرام ہی ہے۔ خواہ تم اسے حلال بنانے کی کتنی ہی کوشش کرو۔

پھر لوگوں سے کہیے کہ اگر خدا اور آخرت اور حساب اور جزا و سزا، یہ سب تمہارے نزدیک محض افسانہ ہی افسانہ ہے تب تو حرام و حلال کی بحث فضول ہے جانوروں کی طرح جس کھیت میں ہریالی نظر آئے اس میں گھس جاؤ اور جائز و ناجائز کی بحث کے بغیر کھاؤ۔ جتنا کھایا جاسکے۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہے کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے اور کبھی اس کے سامنے جا کر حساب بھی دینا ہے تو ذرا اس بات پر بھی غور کر لو کہ آخر یہ حرام کی کمائی کس کے لیے کرتے ہو؟ کیا اپنے جسم و جان کی پرورش کے لیے؟ مگر یہ جسم و جان تو اس خدمت پر تمہارے احسان مند نہ ہوں گے۔ بلکہ تمہارے خلاف خدا کے ہاں استغاثہ کریں گے کہ تو نے ہمیں اس ظالم کی امانت میں دیا تھا اور اس نے ہمیں حرام کھلا کھلا کر پرورش کیا۔ پھر کیا بیوی بچوں کے لیے یہ کرتے ہو، مگر یہ بھی قیامت کے روز تمہارے دشمن ہوں گے اور تم پر الٹا الزام رکھیں گے کہ یہ ظالم خود بھی بگڑا اور ہمیں بھی بگاڑ آیا۔ پھر آخر یہ عذاب الٰہی کے خطرے میں اپنے آپ کو کس لیے ڈال رہے ہو؟ کون ہے جو اس ناجائز خدمت پر تمہارا احسان مند ہو گا؟ کس سے اس بے جا سعی پر صلہ کی توقع رکھتے ہو؟ وہ غیر الٰہی نظامِ حکومت جس کے ایک جز کی حیثیت سے آپ لوگ کام کر رہے ہیں، بجائے خود ناپاک ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خنزیر کے نظامِ جسمانی کی سی ہے۔ جس کی بوٹی بوٹی اور رگ رگ میں حرام سرایت کیے ہوئے ہے اس کے کل پرزے بن کر آپ لوگ پہلے ہی گناہِ عظیم میں مبتلا ہیں۔ اب اس پر خیانت اور رشوت اور باطل طریقوں کے ارتکاب کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو کیوں مزید خطرے میں ڈالتے ہیں کیا کبھی موت آنی ہی نہیں ہے؟ یا ہونے کے بعد کوئی جائے پناہ تجویز کر رکھی ہے جہاں خدا کی پکڑ سے بچ جانے کی امید ہے؟

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۶۲ھ، ستمبر، اکتوبر ۴۳ء)

رشوت و خیانت کے متعلق چند مزید مسائل

سوال :-

رشوت و خیانت کے متعلق ترجمان القرآن کے ایک گزشتہ پرچہ میں رسائل و مسائل کے زیر عنوان آپ نے جن مسائل پر بحث کی ہے انہی کے متعلق چند مزید سوالات مجھے در پیش ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کے مدلل جوابات سے میرے اور میرے بعض رفقاء کے شبہات کو دور فرمادیں گے۔ سوالات حسب ذیل ہیں :-

(۱) ایسے افسروں کو ٹی پارٹیاں دینا بھی کیا رشوت میں شمار ہوگا جن کو حکومت کسی ایک فرد یا جماعت کے کام کی جانچ پڑتال کے لیے وقتی طور پر مقرر کرتی ہے؟ یہ لوگ تو غالباً اصطلاحی افسر کی حیثیت نہیں رکھتے پھر ان کی خاطر و مدارات میں کیا حرج ہے؟

(۲) ایک گروہ کثیر کا خیال ہے کہ موجودہ انگریزی گورنمنٹ کا مال، بالخصوص وہ مال جو پبلک کے مفاد پر صرف نہیں ہوتا بلکہ اسے گورنمنٹ اپنے مفاد اور تحفظ پر صرف کرتی ہے، جس صورت میں بھی لیا جا سکے، لے لینا جائز ہے۔ یعنی خیانتاً یا بذریعہ رشوت وغیرہ۔ اس پر دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ سود جس کا لینا دینا قطعی حرام ہے، اعاظم علماء کے فتووں کے مطابق سرکاری بنک سے وصول کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے کیونکہ اگر اسے بنک میں چھوڑا جائے تو عیسائی مشنریوں کی وساطت سے وہ خود اسلام کے خلاف استعمال ہوگا۔ پھر فرمایئے کہ وہ مال جو کسی غلط نظام حکومت کے استحکام میں صرف ہوتا ہے اور جس کے متعلق یہ بھی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا اپنا نہیں ہے بلکہ رعایا ہی سے بطور غصب لیا گیا ہے کیوں نہ اسے ہر ذریعہ سے واپس حاصل کیا جائے؟

جواب :-

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کا جواب دینے سے پہلے اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم جو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز پر زور دیتے ہیں اور لوگوں کو اپنی اخلاقی ذمہ داریاں سمجھنے اور انھیں ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتے ہیں اس سے ہماری غرض ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام باطل کو ایک ایسی پرہیزگار رعایا فراہم کرکے دیں جو ان کے لیے کم سے کم حد تک وجہ پریشانی ہو۔ درحقیقت اس نظام باطل کے طبعی اور لازمی ثمرات یہی ہیں کہ جو لوگ اخلاقی ذمہ داریوں سے بے پروا اور اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرنے میں قانون کی گرفت کے سوا ہر دوسری قید سے آزاد ہوں۔ ملازموں کا رشوت خوار اور خائن ہونا اور رعیت کا وسیع معنوں میں چور ہونا اس نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس نظام نے انہی صفات کی تخم ریزی کی ہے اور یہ نظام اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے یہی ثمرات اس کی تخم ریزی کے نتیجہ میں پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خائنوں، چوروں اور بداخلاق لوگوں کی قیادت میں پاکیزہ اخلاق رکھنے والے لوگ تو پرورش نہیں پا سکتے۔ بس اخلاق کی گفتگو سے ہماری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان بدسیرت اور بدکار کارفرماؤں کو ان کی کشتِ خبیث کے زہریلے ثمرات سے بچائیں اور صالح ثمرات ان کے لیے فراہم کریں۔ ہمیں جو کچھ فکر ہے وہ دراصل خود اپنے اخلاق اور اپنی سیرت و کردار کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نظام کے برے اثرات سے اپنے بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بچائیں اور ان کے اندر اعلیٰ درجہ کے اخلاق کو نشوونما دیں۔ جن کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں موجودہ بدعمل کارکنوں اور فرمارواؤں کی بہ نسبت صالح تر ٹھہریں اور اللہ تعالیٰ دنیا کی قیادت کے لیے ان کی بہ نسبت ان کو اہل تر قرار دے۔ اس غرض کے لیے ہم ان برائیوں سے بھی لوگوں کو بچنے کا مشورہ دیتے ہیں جن کا ارتکاب اگرچہ موجودہ نظام کے مقابلہ میں کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ شاید بھلائی کی تعریف میں آسکتا ہے۔ مگر وہ بجائے خود اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں مذموم ہیں۔

اب میں سلسلہ وار آپ کے سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں:۔

(۱) جہاں تک میں سمجھتا ہوں، خواہ سرکاری ملازموں کے اپنے مستقل افسر ہوں۔ یا کسی

دوسرے محکمہ کے لوگ ہوں جنھیں ان کے کام کی جانچ پڑتال وغیرہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ مخلصانہ محبت اور شخصی عقیدت وگرویدگی کا تعلق ان کے دلوں میں شاید ایک فی ہزار حالات میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر ان سے مفاد وابستہ نہ ہوں تو غالباً کوئی شخص بھی ان کی خاطر ومدارات کا خیال تک نہ کرے۔ یہ دعوتیں اور ٹی پارٹیاں سب اس غرض سے ہوتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی فائدہ کوئی رعایت یا کم از کم چشم پوشی حاصل کی جائے۔ اس لیے فی الحقیقت یہ بھی اسی طرح رشوت کی تعریف میں آتی ہیں جس طرح عام اور معروف رشوت، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اپنی اصولی توضیح میں بیان کیا ہے۔ موجودہ غیر اسلامی حکومت میں اس کے خلاف ہمیں جو کچھ بھی اعتراض ہے اس بنیاد پر ہے کہ ایسی پارٹیوں کے دینے اور قبول کرنے سے ہمارے اپنے بھائیوں میں ناجائز ذرائع سے کام نکالنے اور لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے کی بیماری پرورش پاتی ہے ورنہ یہ سارا نظام تو حرام سے بنتا، حرام کھاتا اور حرام ہی اگلتا ہے۔

(۲) اس سوال کو جس طریقے سے آپ نے پیش کیا ہے اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ آپ یا جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ صرف اس پہلو کو مدّنظر رکھتے ہیں کہ ایک فریق کے پاس مال کس نوعیت کا ہے۔ مگر اس پہلو کو پیش نظر نہیں رکھتے کہ دوسرا فریق اس کو حاصل کس حق کی بنا پر کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ چور ہے اور اس کے پاس سارا مال چوری کا ہے۔ پھر کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے لیے اس کے ہاں چوری کرنا یا اس کی جیب کتر لینا جائز ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اگر متعین طور پر مجھے معلوم ہو کہ اس کے قبضہ میں فلاں مخصوص چیز میرے مملوکہ مال سے چرائی ہوئی ہے اور پھر میں کسی وقت اسے حاصل کر لینے پر اپنے آپ کو قادر پاؤں۔ تو میرے لیے اس کا حاصل کر لینا جائز ہوگا۔ لیکن یہ عام مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ چور کے مقبوضہ مال کو چرا لینا بہر حال ہر شخص کے لیے حلال ہے۔

سود کی جو مثال آپ نے دی ہے، وہ یہاں اس لیے منطبق نہیں ہوتی کہ سود ہم بینکر سے چھینتے یا چراتے نہیں ہیں بلکہ وہ خود اپنے قاعدے کے مطابق اسے نکالتا ہے۔

اور ہم اس لیے مجبوراً اسے لے لیتے ہیں کہ اسے چھوڑنا ڈاکو کے اسلحہ خانے میں چند اور تلواروں کا چھوڑنا ہے تاکہ وہ ان سے مظلوموں کو ذبح کرنے میں اور زیادہ مدد لے پھر اس سود کو بھی وصول کر کے خود اپنے استعمال میں لانا حلال نہیں ہے بلکہ اسے نادار طبقوں میں تقسیم کر دینا چاہیے اس لیے کہ یہ سارا سود دراصل ان غریبوں ہی کی جیب سے آتا ہے جو کسی دوسرے پر اس بلا کو پھینک دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہاں پھر یہ سمجھ لیجئے کہ ہم حکومت کے اموال پر دست درازی کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ یہ حکومت کسی ایماندارانہ برتاؤ کی مستحق ہے۔ بلکہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود ہمارے اندر استحقاق کے بغیر فائدہ اٹھانے کی بیماری پرورش نہ پائے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول و آخر ۶۳ھ مارچ اپریل ۴۴ء)

پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے

سوال:۔

"میں نے حال ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے، اور اس پیشہ میں خاصا کامیاب ہوا ہوں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک وکیل کو قوانین الٰہیہ کے برخلاف روزانہ قوانین انسانی کی بنا پر مقدمات لڑانے پڑتے ہیں۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس چیز کو حق ثابت کرتا ہے جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں۔ خواہ خدائی قانون کی رو سے وہ حق ہو یا نہ ہو اور اسی طرح باطل اسے ثابت کرتا ہے جو ان قوانین کی رو سے باطل ہے خواہ قانونِ الٰہی کے تحت وہ حق ہی کیوں نہ ہو، محتاط سے محتاط وکیل بھی عدالت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی معاً حق و باطل اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اس معیار کو تسلیم کرتا ہے۔ جس کو انسان کی خام کار عقل نے اپنی خواہشاتِ نفس کے ماتحت مقرر کر رکھا ہے۔ غرضیکہ ایک وکیل کفر کی اچھی خاصی نمائندگی کے فرائض انجام

دیتا ہے۔ لیکن کوئی اور پیشہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا جسے اختیار کر کے آدمی نجاستوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس دوہری مشکل کا حل کیا ہے؟ میں یہ سوال اس مسافر کی طرح پوری آمادگی عمل کے ساتھ کر رہا ہوں جو پابہ رکاب کھڑا ہو۔"

جواب:۔

اپنے پیشہ کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی وہ سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص رزق حاصل کرنا اور مطابق شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچ کر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارہ کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ چکے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت مزدوری، پرائیوٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام[1] ہے۔

(ترجمان القرآن محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

عالمانہ جاہلیت

سوال:۔

"ایک عالمِ دین اور صاحبِ دل بزرگ خطبات اور سیاسی کشمکش (جلد ۳)

---

[1] وکالت کے بارے میں زیادہ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامی قانون" از مصنف

پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملازمتیں غیر اللہ کی اطاعت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ یہ تو اپنی اور اپنے اہل ملک کی خدمت ہے۔ یہ حد درجہ غلط طریق کار ہے کہ خزائن ارض پر ہندو اور سکھ بطور حاکم مسلّط ہوں اور مسلمان شودر کی حیثیت میں صرف مطالبہ گزار بن کر رہ جائیں، اور ملازمت کریں بھی تو اس کی آمدنی کو حرام سمجھ کر کھایا کریں۔ میں حیران ہوں کہ ان کو کیا جواب دوں۔"

جواب:۔

جن صاحب کے اعتراض کا آپ نے ذکر کیا ہے اگر ان کے متعلق آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ عالم دین اور صاحب دل ہیں تو ان کے اعتراضات کو پڑھ کر میں اس کے بالکل برعکس رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا اور صبر کر لیتا لیکن اب آپ سے یہ معلوم کر کے کہ وہ ماشاء اللہ دل اور دین دونوں رکھتے ہیں۔ ان کے یہ خیالات میرے لیے سخت حیرت کے موجب ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ جب اس قسم کی باتیں کریں تو ان سے کوسوں دور رہنا چاہیے بھکے ہوئے جاہلوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ مگر بھکے ہوئے عالموں کو سمجھانے کی کوشش فضول ہے۔ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں ہے اور اگر اس کو پڑھ کر بھی ان لوگوں کو اطمینان نہیں ہوتا تو جس راستے پر یہ چل رہے ہیں اسی پر چلے جائیں، مرنے کے بعد حقیقت ان پر بھی کھل جائے گی اور مجھ پر بھی۔

نوٹ: اس سے پہلے کے استفسار میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے بالمقابل ذرا ان خیالات پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ ایک طرف ایک جدید تعلیم یافتہ سیدھا سادہ مسلمان ہے اور دوسری طرف ایک عالم دین اور صاحب دل بزرگ، اس تقابل سے اندازہ کیجیے کہ جس گروہ کی امتیازی علامت ہی تقویٰ ہونی چاہیے تھی۔ آج وہ کس طرح سوچ رہا ہے اور دوسری طرف جو لوگ دہریت والحاد کی فضا میں ناخدا شناس تعلیم و تربیت پا کر نکلے تھے اور جن کے پاس ان دیندار بزرگوں کی بہ نسبت اپنی غلط روی کے لیے بے شمار عذرات موجود تھے۔ ان کے اندر آج ضمیر کی بیداری کے کیسے خوشگوار آثار نمودار ہو رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۳ھ جنوری، فروری ۴۴ء)

کاسِبِ حرام کے ساتھ معاشی تعلقات کے حدود

سوال:-

(۱) مشترک کاروبار جس میں صالحین و فاجرین ملے جلے ہوں، پھر فاجرین میں بائعِ خمر، آکلِ ربوا، وغیرہ شامل ہوں۔ اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

(۲) کاسِبِ حرام سے روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) کاسِبِ حرام کے ہاں نوکر رہنا یا اس کے ہاں سے کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:-

(۱) تجارت اگر بجائے خود حلال نوعیت کی ہو اور جائز طریقوں سے کی جائے تو اس میں کسی پرہیزگار آدمی کی شرکت محض اس وجہ سے ناجائز نہیں ہو سکتی کہ دوسرے شرکاء اپنا مال حرام ذرائع سے کما کر لائے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ اگر حلال ہے، اور کاروبار حلال طریقوں سے کیا جا رہا ہے تو جو منافع آپ کو اپنے سرمایہ پر ملے گا، وہ آپ کے لیے حلال ہو گا۔

(۲) کاسِبِ حرام سے قرض لے کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے پاس روپیہ حرام کا سہی۔ آپ کو تو وہ حلال راستہ سے پہنچ رہا ہے۔

(۳) کاسِبِ حرام کی دو نوعیتیں۔ ایک وہ جس کا پیشہ فحشاء کی تعریف میں آتا ہے۔ مثلاً زنانِ بازاری کا کسب، اس کے قریب جانا بھی جائز نہیں۔ کجا کہ اس کے ہاں نوکر رہنا۔ دوسرا وہ کاسب حرام ہے جس کا پیشہ حرام تو ہے، مگر فحشاء کی تعریف میں نہیں آتا۔ جیسے وکیل یا سودی ذرائع سے کمانے والا اس کے کسی ایسے کام میں نوکری کرنا جس میں آدمی کو خود بھی حرام کام کرنے پڑتے ہوں۔ مثلاً سود خواری کی سودی رقمیں فراہم کرنے کا کام، یا وکیل کے محرر کا کام، تو یہ حرام ہے لیکن اس کے ہاں ایسے کام پر نوکری یا مزدوری کرنا جو بجائے خود حلال نوعیت کا ہو۔ مثلاً اس کی روٹی پکا دینا یا اس کے ہاں سائیس یا ڈرائیور

کا کام کرنا، یا اس کا مکان بنانے کی مزدوری تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ رہا اس کے ہاں کھانا کھانا، تو اس سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۳ھ جنوری، فروری ۴۴ء)

والدین کی مشتبہ جائداد کی کمائی سے استفادہ

سوال:۔

مدّت سے جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں مگر رزق حرام سے اپنے آپ کو بچانے اور حلال و طیّب طریقوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں ہمارا آبائی ذریعۂ معاش زمینداری ہے اور مجھے یہ معلوم ہے کہ مدّتوں سے ہماری زمینیں نہ تو شرعی ضابطہ کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہوتی ہیں اور نہ ان میں سے شرعی حقوق ادا کیے جاتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مجبوراً میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے والدین سے روپیہ لیتا ہوں، اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آئندہ جو میراث مجھے ان سے پہنچتی ہے وہ مجھے لینی چاہیے یا نہیں؟

جواب:۔

زمانۂ جاہلیت کی جائدادیں جو غیر اسلامی معاشی نظام میں پیدا ہوئی ہوں اور ایک سے دوسرے کو غیر اسلامی طریقوں پر منتقل ہوتی رہی ہوں۔ اصولاً تو ساری کی ساری مشتبہ اور غلط ہوتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جو ایسی جائدادیں انھیں آبا و اجداد کے ترکہ میں پہنچی ہیں انھیں وہ تلف کر دیں یا ان سے دست بردار ہو جائیں اور نہ انھیں یہی تکلیف دی گئی ہے کہ کسی مال کو لیتے ہوئے اس کی ابتدائی اصل کی تحقیق کریں بلکہ حکم صرف یہ دیا گیا ہے کہ جب سے تم اسلام کو اپنے قانونِ زندگی کی حیثیت سے قبول کر رہے

ہو اس وقت سے کوئی مال تمہارے پاس ناجائز طریقہ سے آئے اور نہ کسی ناجائز راستے میں جائے اور یہ کہ جتنے تصرفات اس میں آئندہ تم کرو وہ سب شریعت کے مطابق ہوں، رہے سابق کے اہل حقوق، تو اگر وہ موجود ہوں اور ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو ان کے حق انھیں ادا کر دیے جائیں، ورنہ ایسے اموال کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوئے آئندہ جن لوگوں کے حق ان اموال میں پیدا ہوں وہ ادا کیے جاتے رہیں۔

(ترجمان القرآن محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

سوال:-

ہماری بستی میں ایک صاحب ہیں جو نماز، روزہ، اور زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی کے پابند ہیں۔ گناہ کبیرہ سے پرہیز کرنے والے ہیں۔ مگر ان کا کچھ عجیب حال ہے۔ مثلاً وہ والدین کی خدمت تو سر انجام دیتے ہیں اور ان کے کام میں بھی مدد کرتے ہیں۔ مگر ان کی املاک سے کچھ نہیں لیتے، حتیٰ کہ ان کا کھانا تک نہیں کھاتے، محض اس بنا پر کہ ان کے والد کاروبار کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی طرح تمام عزیز و رشتہ دار جن کی کمائیوں میں انھیں حرام آمدنی کے شامل ہونے کا شبہ ہوتا ہے ان کے ہاں بھی کھانے پینے سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رشوت خوروں، سرکاری ملازموں سودی لین دین کرنے والوں اور فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں بد دیانتی کرنے والوں سے بھی ان کا یہی معاملہ ہے۔ حد یہ کہ ایک امام مسجد ہیں جن کو ناجائز کمائی کرنے والے بعض اصحاب وظیفہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ان کے ہاں بھی کھانے یا چائے وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر کبھی سفر میں مجبوراً کسی ایسے شخص کے ہاں کھانا کھا لینے کی نوبت آئے تو یہ کھانے کی قیمت کا

اندازہ کر کے اس سے زیادہ قیمت کا کوئی ہدیہ وہاں روانہ کردیں گے اور اگر کسی ناجائز کمائی کرنے والے کے ہاں مجبوراً کچھ کھا پی لیں گے تو اندازاً اس کا معاوضہ خیراتی فنڈ میں جمع کر کے یہ دعا کریں گے کہ یا اللہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچے جس کے ہاں سے میں نے کھایا پیا ہے۔ اس سارے معاملہ کی اس دوسرے شخص کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔

خود ان مسلم متقی صاحب کی آمدنی ایک قطعی جائز تجارت سے ہوتی ہے جس میں یہ کوئی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس کمائی سے اعزّہ اور احباب کو کھانے اور چائے کی دعوت اکثر دیتے رہتے ہیں۔ اب ان کی اس پرہیزگاری سے ان کے والدین اور دوسرے اعزّہ سخت نالاں ہیں۔ پڑوسیوں میں بھی ایک ہلچل مچ گئی ہے اور بستی میں ان کے خلاف ناراضی پیدا ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے ہمیں یہ بتائیے کہ یہ متقی صاحب صحیح راستہ پر ہیں یا نہیں؟ ان کی روش قرآن وحدیث کی حدود کے اندر ہے یا متجاوز؟ اور ان کا یہ تقویٰ ٹھوس اصولی ہے یا فروعی یا مستحب؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ انھیں ان کے نفس نے فریب دیا ہو؟

جواب:-

آپ کا سوال پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ بجائے اس کے کہ آپ کی بستی کے لوگ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ان کے درمیان ایک نیک بندہ ایسا ہے جو خود حلال کی کمائی کھاتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتا ہے اور اگر دوسرے لوگ حرام رزق یا مشتبہ رزق کھانے والے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس ناپاکی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز بجائے اس کے کہ لوگ اس کی زندگی سے سبق لیتے اور خود اس کے ماں باپ اور رشتہ دار شکر بجالاتے کہ ان کے گھر میں ایک ایسا پرہیزگار مردِ خدا پیدا ہوا ہے بستی کے لوگ اور ماں باپ اور اقربا الٹے اس سے بگڑتے ہیں اور اس کے متعلق پوچھ رہے ہیں کہ اس کی یہ پرہیزگاری کیسی ہے۔ وہ اگر اعتدال سے زیادہ

سختی بھی کر رہا ہے تو اس کی زیادتی نیکی کی طرف ہے نہ کہ برائی کی طرف۔ آپ لوگوں کو اس کی پرہیزگاری کے متعلق پوچھنے کے بجائے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ جو لوگ تجارت جیسے پاک ذریعۂ رزق کو بھی جھوٹ سے ناپاک کر لیتے ہیں اور جو لوگ رشوت اور ظلم اور ایسے ہی دوسرے حرام ذرائع سے روزی حاصل کرتے ہیں ان کی یہ ناپرہیزگاری کیسی ہے؟ قصوروار کون زیادہ ہے؟ وہ جوان گندگیوں سے خود بچتا ہے اور دوسروں کو بچانا چاہتا ہے یا وہ جوان گندگیوں میں خود مبتلا ہوتے ہیں اور بچنے والے کو الٹی ملامت کرتے ہیں؟

مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں۔ اور رب العالمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے الٹے نکو بن جاتے ہیں۔

متعفّن فضا میں اگر کہیں سے خوشبو کی ایک ذرا سی لپٹ آ رہی ہو تو تندرست دماغ اس کی طرف لپکتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ ساری فضا ہی ایسی ہو جائے لیکن ماتم کے قابل ہے ان بیمار دماغوں کا حال جو خوشبو کی اس لپٹ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فضا میں اتنی سی خوشبو بھی باقی نہ رہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ فضا کی عفونت نے ان دماغوں کو اندر تک سڑا دیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کے لیے بدبو گوارا ہو گئی ہے اور خوشبو ناگوار۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاوّل ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

امانت، قرض اور صلہ رحمی

سوال:۔

(۱) امانت رکھنے اور رکھوانے والے کو کیا کیا اصول ملحوظ رکھنے چاہئیں؟

(۲) قرض حسنہ لینے اور دینے میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے؟

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم کیا ہے اور شریعت میں اس کی اہمیت کس حد تک ہے؟

جواب :-

(۱) امانت اصل میں دو آدمیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھتا ہے وہ گویا اس پر اعتماد کرتا ہے کہ وہ اپنی حد استطاعت تک پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی حفاظت کرے گا اور جو شخص اس امانت کو اپنی حفاظت میں لینا قبول کرتا ہے وہ بھی امانت رکھنے والے پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ ایک جائز قسم کی امانت اس کے پاس رکھ رہا ہے کوئی چوری کا مال یا خلافِ قانون چیز نہیں رکھ رہا ہے۔ نہ اس امانت کے ذریعہ سے کسی قسم کا دھوکا یا فریب کر کے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پس دونوں پر اس کے سوا کسی اور چیز کی پابندی لازم نہیں ہے کہ وہ اس اعتماد کا پورا پورا حق ادا کریں۔

(۲) قرض دینے اور لینے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ حتی الامکان فریقین کے درمیان شرائط قرض صاف صاف طے ہوں۔ مدّت کا تعین ہو جائے تحریر اور شہادت ہو۔ جو شخص قرض دے وہ اس قرض کے دباؤ سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ مقروض کو احسان رکھ کر نہ ذلیل کرے اور نہ اذیت پہنچانے کی کوشش کرے اور اگر مدّت گزر جائے اور فی الواقع مقروض شخص قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو جہاں تک ممکن ہو مہلت دے اور اپنے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ کرے۔ دوسری طرف قرض لینے والے کو لازم ہے کہ جس وقت وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو اسی وقت ادا کر دے اور جان بوجھ کر ادائے قرض میں تساہل یا ٹال مٹول نہ کرے۔

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم رشتہ داری کے تعلق کی بنا پر ہمدردی، معاونت، حسن سلوک و خیر خواہی اور جائز حدود تک حمایت کرنا ہے، اس کی کوئی حد نہ مقرر ہے نہ کی جاسکتی ہے دراصل یہ عام معروفات میں سے ہے جنھیں لوگ خود ہی جانتے ہیں اور صلۂ رحمی میں کوتاہی کرنا یا قطع رحمی کرنا ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن کی سخت مذمت قرآن و

حدیث میں کی گئی ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

کنوز کا نصاب زکوٰۃ

سوال :-

تمام کتبِ فقہ میں مذکور ہے کہ چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم (۵۲½ تولہ) ہے اور سونے کا ۲۰ دینار (۷½ تولہ) اور علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس چاندی اور سونا دونوں ہوں اور ہر ایک نصاب مقررہ سے کم ہو تو اس صورت میں سونے کی قیمت چاندی سے لگا کر، یا چاندی کی قیمت سونے سے لگا کر۔ دونوں میں سے جو صورت بھی انفع للفقراء ہو۔ مجموعہ کو دیکھیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ لیکن وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر صرف چاندی ہو تو چاندی کا نصاب ہوگا اور اگر صرف سونا ہو تو سونے کا نصاب حساب کی اساس ہوگا اس بنا پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ساٹھ روپے ہوں تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ مگر جس کے پاس ۶ تولہ سونا ہے وہ زکوٰۃ سے بری ہے حالانکہ مالدار ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ موجودہ نرخ کے مطابق تقریباً ۵۰۰ روپے کا مالک ہے۔ بہر حال علماء کے فتوے شخص اوّل پر زکوٰۃ فرض قرار دیتے ہیں اور شخص ثانی پر زکوٰۃ عائد ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن کم مالدار سے زکوٰۃ لینا اور زیادہ مالدار کو چھوڑ دینا تعجب انگیز بات ہے۔

میں تو اپنی جگہ یہ سمجھا ہوں کہ زمانۂ قدیم میں چاندی اور سونے کی مالیت میں وہ نسبت نہ تھی جو آج کل ہے۔ آج کل تو ۱=۷۵ یا ۱=۸۰ کی نسبت ہے مگر دورِ نبوی میں تقریباً ۱=۷ کی تھی زکوٰۃ کی فرضیت میں مالیت کا اعتبار

کیا گیا ہے اور ۱۴۰ مثقال چاندی کنوز کا بنیادی نصاب زکوٰۃ ہے۔ نبی کریمؐ نے زکوٰۃ کا نصاب معین کرتے ہوئے اسی چاندی کی مقدار کو ذکر فرمایا۔

اس دور میں ۴۰ امثقال چاندی کی مالیت کا سونا چونکہ ۲۰ مثقال (۷½ تولہ) ہی بنتا تھا اس لیے یہ نصاب قرار پایا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تاقیامِ قیامت سونے کی زکوٰۃ کے لیے ۷½ تولہ ہی مستقل نصاب معین رہے۔ بلکہ سونے کی وہ مقدار نصاب زکوٰۃ ہوگی جو ۵۲½ تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو۔ یعنی جس شخص کے پاس سونا ہو وہ اس کی قیمت لگا کر دیکھے۔ اگر وہ ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہے یا اس سے بڑھ جاتی ہے تو اس پر زکوٰۃ ادا کرے۔

میرے اس خیال کی تائید نہ کسی فقہی کتاب کی عبارات کرتی ہیں نہ علمائے وقت ہی اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس وجہ سے مجھے اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہے۔ آپ جس پہلو کو مرجح قرار دیں میرے لیے موجب اطمینان ہوگا۔

جواب:۔

آپ کا خیال اس حد تک تو درست ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاندی اور سونے کی قیمتوں میں وہی نسبت تھی جو نصاب کی مقدار سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ۵۲½ تولہ چاندی، ۷½ تولہ سونا۔ لیکن آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ اب نسبتوں میں جو فرق عظیم ہوگیا ہے اس کی وجہ سے سونے کے نصاب کو بدل کر اس کے لیے بھی چاندی ہی کی قیمت کو نصاب بنا دیا جائے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

۱۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اصل سونے کو قرار دیا جائے یا چاندی کو؟ سونے کا نصاب چاندی کی قیمت کے معیار پر کم وبیش کیا جائے یا چاندی کے نصاب کو سونے کی قیمت کے معیار پر گھٹایا اور بڑھایا جاتا رہے؟ ان میں سے جس کو بھی اصل اور معیار

قرار دیا جائے گا وہ ایک غیر شرعی فعل ہوگا۔ کیوں کہ شارع نے دونوں کا حکم الگ الگ مستقلاً بیان کیا ہے اور اشارتاً وکنایتاً بھی کوئی بات ایسی نہیں فرمائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو کہ سونے اور چاندی میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے اصل اور معیار قرار دینا شارع کا منشا تھا۔

۲۔ محض انفع للفقراء ہونا کوئی ایسی قطعی اور ثابت شدہ اصل نہیں ہے۔ جس پر اعتماد کر کے شارع کے ایک منصوص حکم میں ترمیم کرنے کی جرأت کر ڈالی جائے۔

۳۔ سونے اور چاندی کی نسبتوں میں آئے دن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر ان کی مقداروں کا الگ الگ مستقل نصاب نہ ہو اور ایک کے نصاب کو دوسرے کی آئے دن بدلنے والی قیمتوں پر موقوف کر دیا جائے تو ان دائمی تغیرات کی وجہ سے کوئی ایک مستقل شرعی حکم باقی نہ رہے گا اور عوام الناس کو تعمیل حکم میں عملی زحمتیں بھی پیش آئیں گی۔

۴۔ جو مشکل آپ سونے اور چاندی کے معاملے میں پیش کر رہے ہیں وہی بکریوں اونٹوں، گایوں، بھینسوں اور گھوڑوں کے نصاب میں بھی پیش آتی ہیں۔ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبتوں میں بھی مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بہت بڑا فرق ہوتا رہتا ہے اور ان کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کی قیمت کو اصل قرار دے کر دوسری سب انواع نصاب کو اس کے مطابق بدلا جاتا رہے۔

ان وجوہ سے مناسب یہی ہے کہ مختلف اشیاء کی زکوٰۃ کے لیے خود شارع نے جو نصاب مقرر کر دیا ہے اور جس مقدار یا تعداد پر جو زکوٰۃ عائد کر دی ہے اسی کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ (ترجمان القرآن، رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

دارالکفر میں سود خواری

سوال:۔

ایک متدین بزرگ جو ایک یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر بھی

ہیں اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"جو تاجر یا زمیندار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہیں اگر وہ ڈاکخانہ یا امپیریل بنک میں روپیہ جمع کر کے گورنمنٹ سے سود وصول کریں تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹیکس یا لگان کے گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے۔

ایک دوسرے مشہور و معروف عالم دین اس سے آگے قدم رکھ کے فرماتے ہیں :۔

قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، الغرض کسی بھی شرعی دلیل سے حربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت کوئی صاحب پیش کر سکتے ہوں تو کریں۔ افسوس کہ علماء اسلام نے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ ادھر ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے۔ غالباً یہ صورتِ حالات نہ ہوتی۔ ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ سود دیتا رہا۔ اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں، بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لیے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت کا علاج موجود تھا۔ لیکن انھوں نے ایک جزو پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔"

علمائے کرام کی ان بحثوں نے ہم کو اس تذبذب میں ڈال دیا ہے کہ سود سے اجتناب کی جس روش پر ہم اب تک قائم ہیں کہیں وہ غلط تو نہیں ہے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہو گا کہ ایک طرف تو ہم آخرت ہی کے اجر کی امید پر دنیا میں نقصان اٹھائیں اور دوسری طرف آخرت میں جا کر ہم کو یہ جواب مل جائے کہ تمہارا سود سے اجتناب کسی شرعی حکم کے مطابق نہ تھا۔ لہٰذا تم کسی اجر کے مستحق نہیں ہو۔

جواب :۔

سود کی حرمت قرآن اور حدیث کی قطعی نصوص سے بالتصریح ثابت ہے۔

فقہ کی کوئی اصطلاحی بحث ان نصوص کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ علماء کے ان ارشادات کے باوجود آخرت میں آپ کا اجر محفوظ ہے۔

قانون کی پیچیدہ بحثوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم ایک سیدھے سادے مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھیں تو بداہۃً یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام دین و اخلاق اور تمدن و تہذیب کے ان اصولوں کی علمبرداری کرنا ہے جنھیں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں حق کہا گیا ہے اور دنیا سے ان خیالات اور طریقوں کو مٹانے کی کوشش کرنا ہے جنھیں قرآن اور سنت نے باطل ٹھیرایا ہے جس سرزمین میں باطل کا غلبہ ہو اور احکامِ کفر جاری ہو رہے ہوں وہاں ہمارا کام باطل کے طریقوں کو اختیار کر لینا نہیں ہے بلکہ ہمارا اصلی منصب یہ ہے کہ ہم وہاں رہ کر قرآن کے قانونِ حیات کی تبلیغ کریں۔ اور نظامِ کفر کی جگہ نظامِ اسلامی قائم کرنے کے لیے ساعی ہوں۔ اب غور کیجیے کہ اگر ہم خود سود کھائیں گے تو کفار کی سود خواری کے خلاف آواز کس منہ سے اٹھائیں گے؟ کفار اگر ناجائز طریقوں سے ہمارے اموال لے رہے ہیں یا حکومتِ کفر ہمارے اموال سے اگر بلا استحقاق (یعنی خدا کی سند پر مبنی حق کے بغیر) کوئی حصہ لے اڑتی ہے تو ہمارے لیے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ ہم ان اموال کو واپس لینے کے لیے ویسی ہی ناجائز کارروائیاں کرنے لگیں اور کسبِ حرام کو اپنا حق واپس لینے کا ذریعہ بنائیں؟ اس طرح تو سود خواری کے ساتھ شراب فروشی، مزامیر سازی، فحش فلم بنانا، عصمت فروشی، کاروبار رقص و سرود، بت تراشی، فحش نگاری، سٹہ بازی، جوئے بازی اور سارے ہی حرام کاموں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر یہ فرمائیے کہ ہم میں اور کفار میں وہ کون سا اخلاقی فرق باقی رہ جاتا ہے جس کے بل پر ہم دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کر سکیں؟

اصل میں مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ حکومتِ کفر کے آئین کی رُو سے تو یقیناً آپ یہ سارے ڈھنگ اختیار کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن شریعتِ اسلام کی رو سے آپ پر یہ سب حرام ہیں۔ اگر آپ شریعتِ اسلام کے پیرو ہیں تو آپ حکومتِ کفر کے آئین کی ڈھیل سے

فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے اور اگر آپ ایک طرف دنیا کو شریعتِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ فائدوں کے لیے یا کچھ نقصانات سے بچنے کے لیے حرام خوری کی ان گنجائشوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جو آئین کفر نے دی ہیں۔ مگر آئین اسلام نے جن کی سخت مذمت کی ہے تو چاہے فقیہہ شہر آپ کے اس طرزِ عمل کے جواز کا فتویٰ دے دے، لیکن عام انسانی رائے اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ پھر بھی وہ آپ کی تبلیغ کا کوئی اخلاقی اثر قبول کرے گی۔

حقیقتاً اس طرزِ فکر کو فقہ اسلامی میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کہ مسلمانوں کو فلاں تکلیف اور فلاں نقصان جو حکومتِ کفر کے تحت رہتے ہوئے پہنچ رہا ہے اسے روکنے کے لیے نظام باطل ہی کے اندر کچھ شرعی وسائل پیدا کیے جائیں۔ یہ طریق فکر مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اسلام کو بدلتا ہے یعنی تجدید دین کی جگہ تجدّد کا دروازہ کھولتا ہے۔ جو نظامِ دینی کے لیے حد درجہ تباہ کن ہے اور افسوس یہ ہے کہ غلبۂ کفر کے زمانہ میں فتویٰ نویسی کچھ اسی راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس طریقہ نے مسلمانوں کو نظامِ باطل کے اندر راضی اور مطمئن زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ دین حق کے عین منشا ہی کے خلاف ہے ہم اِس طرزِ فکر کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، خواہ کیسے ہی بڑے بڑے علما اس کے حامی ہوں۔ نظامِ باطل کے تحت مسلمانوں کے لیے تکلیف اور نقصان کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اس تکلیف اور نقصان کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اس نظام کو بدلنے کے لیے جدوجہد کریں نہ یہ کہ کفر کے زیر سایہ کسی قدر سہولت سے جینے کے لیے شریعت کو موافقِ حال بنائیں۔[1]

(ترجمان القرآن۔ رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

غیر محرم قریبی اعزّہ سے پردے کی صورت

سوال:۔

کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "سود" از مصنف

کے لیے مجبور کرسکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ کہ سسرال اور میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہمارے آج کل کے نظامِ معاشرت میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب :-

شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کا بیوی کو حکم دے اور اگر وہ ایسا حکم دے تو ایک مسلمان عورت کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت سے انکار کردے۔ سورۂ نور کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کی فہرست دیدی ہے جن کے سامنے ایک مسلمان عورت اپنی زینت کے ساتھ آسکتی ہے ان کے سوا کسی اور کے سامنے اظہار زینت کا حکم دینا کسی مسلمان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں جو بالکل غیر مردوں سے پردہ کی نوعیت ہے۔ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے بغیر زینت کے سادہ لباس میں پورے ستر کے ساتھ آسکتی ہیں مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے ہونا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ یہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنا اور تنہائی میں بیٹھنا جس کا رواج ہماری موجودہ سوسائٹی میں بڑی کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ شرعی احکام کے قطعی خلاف ہے اور بعض رشتہ دار مثلاً دیوروں کے ساتھ ایسے تعلقات کی تو حدیث میں صریح ممانعت موجود ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے وہ میں نے بتا دیا ہے مگر مسلمانوں میں رواج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہوگئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف بکثرت مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے دوسری طرف یہی لوگ رشتہ داروں کے معاملہ میں تمام حدود شرعیہ

کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں اس معاملہ میں اگر کوئی شخص احکام شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد کرنا چاہے تو شاید بہت سے خاندانی تعلقات کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرسکتا۔
(ترجمان القرآن، رجب شعبان ۶۴ھ، جولائی اگست ۴۵ء)

پردے کے متعلق چند عملی سوالات

سوال :۔
آپ کی کتاب "پردہ" کے مطالعہ کے بعد میں نے اور میری اہلیہ نے چند ہفتوں سے عائلی زندگی کو قوانین الٰہیہ کے مطابق بنانے کی سعی شروع کر رکھی ہے مگر ہمارے اس جدید رویہ کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمارے والدین سخت برہم ہیں اور پردہ کو شرعی حدود و ضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر برافروختہ ہیں خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں۔ پس تسلی کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتے ہیں:۔
(۱) سورۂ احزاب کی یہ آیت کہ "عورتوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے .... الخ"
اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ آیت میں جن اعزّہ کا ذکر ہے ان کے سوا عورتوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (اِلاّ بہ اشد مجبوری) صریحاً گناہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب بالکل برابر ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟
(۲) کیا غیر محرم اعزّہ (مثلاً چچازاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں) کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لیے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟
(۳) اگر کسی غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی

غیر محرم عزیز بطور مہمان آ رہے تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جاسکے گا؟ اسی طرح کسی قریبی عزیز کے ہاں جانے پر اگر زنانے سے بلا وا آوے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

(۴) اگر گھروں میں جوان ملازم کام کاج کے لیے آئیں جائیں تو سن رسیدہ عورتوں کے لیے تو جو رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے مگر جوان عورتیں صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ ہو سکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟

(۵) اگر خدا اور رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی کی والدہ آحائل ہو تو اس کے حکم کو رد کیا جاسکتا ہے یا نہیں جب کہ اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

(۶) کیا عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا؟

(۷) کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر یا نرس یا معلمہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں ان سب کاموں میں حصہ لے کر گذشتہ نقصانات اور پسماندگی کی تلافی کریں اسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں اور آیا انھیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہوگا یا ضرورتاً پردہ سے باہر بھی آسکتی ہیں؟

(۸) کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں؟

جواب :-

(۱) آپ نے قرآن مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، سورہ احزاب میں نہیں ہے بلکہ سورۂ نور میں ہے اور اس میں الفاظ یہ ہیں کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا.... (النور: ۳۱) یعنی یہ بجز ان لوگوں کے اور کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں بناؤ سنگھار اور آرائش کے ساتھ دوسرے لوگوں کے

سامنے نہ آئیں۔ دوسری طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ "يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ" (الاحزاب: ۵۹) یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر گھونگھٹ کے طور پر لٹکا لیا کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بالکل اجنبی لوگوں کے سامنے تو چہرہ کھولنا بھی درست نہیں ہے۔ رہے اعزہ و اقرباء، تو ان میں سے جن لوگوں کا ذکر سورۂ نور والی آیت میں کیا گیا ہے صرف ان کے سامنے عورت پوری آزادی سے اپنی زینت کے ساتھ آسکتی ہے۔ باقی دوسرے اعزہ و اقربا کے سامنے زینت کے ساتھ آنا جائز نہیں ہے۔

(۲) سامنے ہونے کے دو مطلب ہیں ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس طرح کی آزادی اور بناؤ سنگھار کے ساتھ سامنے ہونا جیسے باپ بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے اور بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا، بولنا حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز کسی قسم کے غیر محرم مردوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر نیز سر کو ڈھانک کر صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے ہوئے کسی کے سامنے آئے، اور وہ بھی اپنے آپ کو دکھانے کی غرض سے نہیں بلکہ ان ناگزیر ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جو مشترکہ خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں۔ مگر آزادی کے ساتھ بیٹھ کر خلا ملا نہ کرے۔ خلوت میں بھی اس کے ساتھ نہ رہے اور صرف اس طرح سامنے ہو کہ مثلاً اس کے سامنے سے گزر جائے یا کوئی ضروری بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے اس حد تک غیر محرم اعزہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم مانعت نہیں ہے بہر حال چچا زاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تکلفی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعتِ اسلامیہ میں ان بے اعتدالیوں کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

(۳) ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہ عمل یہ ہے کہ کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدہ کے مطابق استیذان (طلب اجازت) کرے۔[1]

---

[1] افسوس ہے کہ قرآن و سنت کے حکم استیذان کو آج مسلمانوں نے اپنی معاشرت سے بالکل ہی خارج=

پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو چاہیے کہ کوئی چیز اوڑھ کر اپنی زینت کو چھپا لے اور ذرا اپنا رخ بدل لے، یا پیٹھ موڑ لے اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیز کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح بہ ضرورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں البتہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ہنسی مذاق بالکل ناجائز ہے

(۴) ملازموں کے معاملہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ "غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ" کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی برا خیال ان کے دل میں آنے کی توقع نہیں ہے) ان کو گھر میں آنے جانے اور کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی یہ رائے نہ ہو ان کا گھروں میں آنا جانا جائز نہیں ہے۔ بہر حال اس معاملہ میں گھر کے قوام کا اجتہاد معتبر ہے۔ بشرطیکہ وہ شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو۔ نہ کہ حدود شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹالنے والا ہو۔

(۵) ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے۔ لیکن حکم صرف اسی ماں کا مانا جا سکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے، یعنی خدا اور رسول کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خاندانی رواجوں پر شریعت کو قربان کر دینے والی نہ ہو، رہی وہ ماں جو اس کے برعکس صفات رکھتی ہو۔ تو اس کی خدمت تو کی جاتی رہے گی مگر شرعی امور میں اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ شریعت کی پابندی سے آزاد ہو کر اپنے نفس یا برادری کی شریعت کو خدا کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا، پھر آخر اس کے پاؤں کے نیچے جنت کیسے ہو سکتی ہے۔

(۶) بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پابندی کے ساتھ مردوں

= کر دیا ہے اور اجازت مانگے بغیر گھر میں گھس آنے کو بے تکلفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ شرعاً خود گھر کے مردوں، حتیٰ کہ باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو بھی لازم ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو کم از کم کھنکار دیں یا اور کوئی ایسی آواز کر دیں جس سے گھر کی عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی مرد آ رہا ہے۔

کو خطاب کرے، لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ اور شریعت کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

(۷) لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور ان کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں، تو پھر اسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اسلامی تہذیب اس تہذیب کا نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے البتہ اگر نظامِ تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقہ پر لڑکیوں کو تیار کر کے ان سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فنِ طب، سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیتِ اطفال کی اعلیٰ تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر معلمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً لائق تصریح ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریہ کے قائل نہیں ہیں کہ تیمارداری (نرسنگ) کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ و مردانہ سب قسم کے ہسپتالوں میں نرس عورت ہی ہونی چاہیے ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرمناک ہے کہ نرس خواتین سے مرد بیماروں کی تیمارداری کے وہ کام لیے جائیں جنھیں مرد تیماردار بھی

انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں۔ اس بنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیمارداری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہئیں۔

(۸) جنگ کے موقع پر تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں لیکن یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور ان بدمعاشیوں سے پاک ہو جن میں آج کل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے W.A.C. کے معصوم نام سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی۔

(ترجمان القرآن، رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

رسموں کی شریعت

سوال:-

چند اشکال در پیش ہیں، ان کے متعلق شرعی رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے۔

ا۔ ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے، افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہش مند ہے یعنی شادی ذرا تزک و احتشام سے کر کے وقتی سی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رہنمائی کیسے کی جائے؟

ب۔ ایک مقروض مسلمان جو تمام اثاثہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت

نہیں رکھتا۔ بیٹے بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سامنے آتی ہیں جو بہر حال صرفِ کثیر چاہتی ہیں تو اس کے لیے کیا راہِ عمل ہے؟

ج۔ عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو۔ چنانچہ اسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو طے کر کے بڑھاپے کی سرحد میں جا داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں اس معاملہ میں اسلام کیا کہتا ہے؟

د۔ موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چلّہ باجہ، منگنی، جہیز اور اسی طرح چالیسواں، قل وغیرہ کی جو رسوم انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

جواب :-

۱۔ ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے اور پھر محض دنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے گڑھے میں پھینک رہا ہے اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی قرض لے گا، یا کسی ہمدرد کی جیب پر ڈاکہ ڈالے گا، اور اگر اسے قرضِ حسن مل گیا جس کی امید نہیں ہے تو اسے مار کھائے گا اور اس سلسلہ میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنی بے ایمانیاں اس سے سرزد ہوں گی آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جا سکتا ہے جو محض اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے بڑے گناہ جانتے بوجھتے اپنے سر لینے پر آمادہ ہے۔

ب :۔ ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کرنی چاہئیں جو مالی حیثیت سے اسی جیسے ہوں اور جو اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں پھیلائیں اور نہ دوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلانے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

ج :- یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے لیکن اس کو "حد" سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے، اگر کسی شخص کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور اسے کوئی مناسب لڑکا نظر آئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے میں ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابۂ کرامؓ میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی ذلت کی بات ہوتی تو نبیؐ اس کو منع فرما دیتے۔

د :- یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں۔ ان میں پھنس کر ان کی زندگی آپ تنگ ہوئی جا رہی ہے لیکن لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان کو کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہِ راست ان رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن اور سنت کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقہ پر لوگ آجائیں تو بڑی خرابیاں بھی دور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

سوال :-

میں عرصہ سے تجرّد کی زندگی گزار رہا ہوں اور اس سب کی ذمہ داری میرے "اجتہاد" کے سر ہے۔ ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارے میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو ان کو "ناجائز" اور "غیر شرعی رسم" کا کہنا مشکل ہوگا مثلاً یہ کہ منسوبہ یا منکوحہ کے لیے زیور دیا رچہ جات کا مطالبہ کچھ آپس کے لین دین ایک دوسرے کنبوں اور خدمت گاروں کو بطور عطیہ و انعام کچھ دینا دلانا، برادری اور اہل قرابت کو بلانا اور ان کی ضیافت کرنا وغیرہ۔ یہ بہت سی چیزیں بظاہر اگر علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے دیکھی جائیں تو ان میں سے غالباً کسی ایک کو بھی ناجائز نہ کہا جا سکے گا لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ان کی پابندی اور التزام اس حد تک ہے کہ ان کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کسی درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز کر ہی نہیں سکتا۔ تو بالکل

صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف "مباح" کے درجہ پر باقی نہیں رہی ہیں بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گویا مجرم متصور ہوتا ہے پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر باطل قانون کو توڑ دیا جائے چاہے وہ کہیں ہو تو سوال یہ ہے کہ آیا مذکورہ بالا چیزیں اس شکست و ریخت کی مستحق ہیں یا نہیں ؟ اگر یہ حملہ کی مستحق ہیں، جیسا کہ میری رائے ہے تو کیا یہ حقیقت آپ سے مخفی ہے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کی "شریعتِ رسوم" نافذ العمل نہ ہو خواہ اس کی تفصیلی اشکال کچھ ہی ہوں جن تقریبات کو آج کل "شرعی تقریبات" کہا جاتا ہے وہ بھی بس صرف اس حد تک "شرعی" ہوتی ہیں کہ ان میں ناچ، باجہ، گاجہ، اور ایسی ہی دوسری خرافات و مزخرفات نہیں ہوتیں لیکن مذکورۂ بالا رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں اور انھیں "اباحت" کی چادر میں چھپا لیا جاتا ہے، پس کیا جماعتِ اسلامی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اراکین کو "غیر شرعی رسوم" کی وضاحت اس طرح کر کے بتلائے کہ یہ "اباحت" کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل مسنون طریقہ پر منائیں ؟

اگر ان رسوم کے خلاف میرا احساس صحیح نہ ہو تو پھر وضاحت سے "شریعتِ رسوم" کے واجبات کو قابلِ بغاوت قوانینِ باطل سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجوہ تحریر فرمائیں۔ اس سے اگر میرا اطمینان ہو گیا تو تجرّد کی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکے گی اور اگر آپ نے میری رائے کی تصدیق کی تو پھر میرے لیے بظاہر کامیابی کا کہیں موقع نہیں ہے مگر مجھے اس سے بڑی مسرّت ہوگی کیونکہ پھر یہ تکلیف صحیح معنوں میں اللہ کی راہ میں ہوگی۔ وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا۔
(الطلاق: ۱)

جواب :-

ہم "الاقدم فالاقدم" کے اصول پر کام کر رہے ہیں، پہلے دین کی جڑوں کو دلوں میں جمانا

ضروری ہے اس کے بعد تفصیلات کو ایک دم ترتیب و تدریج کے ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں اور کونوں میں درست کرنے کا موقع آئے گا اگر ہم شادی، بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات وجزئیات بیان کرنے پر اتر آئیں تو ہماری اصولی دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا اس لیے جہاں تک دین کے بنیادی امور کا تعلق ہے ہم ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے ان کے متعلق ہم سردست اجمال سے کام لے رہے ہیں۔

شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلہ پر نہ پہنچ جائے جہاں ان چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پر اصرار کرنا چاہیے جن کو صریحاً خلاف شریعت کہا جا سکتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرتِ اسلامی کی روح کے تو خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون وشریعت بنی ہوئی ہیں تو ہمارے ذوقِ اسلامی پر خواہ کتنی ہی گراں ہوں لیکن سر دست ہمیں ان کو اس امید پر گوارا کر لینا چاہئے کہ بتدریج ان کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا کرنا رضامندی کے ساتھ نہ ہو بلکہ احتجاج اور فہمائش کے ساتھ ہو۔ یعنی ہر ایسے موقع پر یہ واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اس طرح کے نکاح چاہتی ہے جیسے ازواج مطہرات اور دوسرے صحابۂ کرام کے ہوئے تھے لیکن اگر تم لوگ یہ تکلفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے کہ جب تم نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کی طرح سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو۔

ہمارا یہ رویہ تو عام لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی امور میں معاملہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن خود ارکان جماعت کے درمیان ایسے جتنے روابط اور معاملات بھی ہوں، انھیں رسوم کی آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی سطح پر لے آنا چاہیے۔ جس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے انھیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں مباحات کو مباحات ہی کی حد تک

رہنا چاہیے اور ان میں سے کسی چیز کو قانون اور شریعت کے درجہ تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ رواج کی رو میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر پہل کی جسارت نہیں کر سکتے۔ رسموں کی بیڑیوں سے نجات حاصل تو کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انھیں کاٹنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اپنی پیٹھوں پر لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمریں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں مگر ان کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرّہ کے معاملات اور تقریبات کو گوناگوں پابندیوں سے آزاد کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے اور لوگوں کی "ناک" بچانے کے لیے خود نکوّ بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو سوسائٹی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے۔

سوال:۔

ہمارے علاقہ میں عام طور پر نکاح کا مہر نو صد روپیہ معین ہوتا ہے، اس میں سے تین سو روپیہ کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور چھ سو روپیہ کی رقم وصول طلب رہتی ہے، لیکن بالعموم مرد کی طرف سے اس چھ سو کی ادائیگی کی نوبت کبھی نہیں آتی۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کا نکاح آج سے تقریباً ۵ سال قبل ہوا تھا اور اس کا مہر دس ہزار روپیہ قرار پایا تھا۔ لڑکے کی طرف سے اوّل اوّل اتنے بڑے مہر کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہوتا رہا مگر آخر کار محض اس وجہ سے یہ ہٹ چھوڑ دی گئی کہ یہ سب کچھ ایک نمائشی رسم کے سوا کچھ نہیں۔ اب اسی رشتہ دار کی دوسری لڑکی کی نسبت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ طے پائی ہے اور اب جلد ہی اس کا نکاح ہونے والا

ہے لڑکی کے اولیا کی طرف سے قبل از وقت یہ اطلاع پہنچادی گئی ہے کہ مہر وہی نو دس ہزار روپیہ مقرر ہوگا۔ اگر اس رقم میں اب کوئی کمی کی جائے تو ان کا پہلا داماد بگڑ جائے گا کہ جب اس کے لیے دس ہزار روپیہ مہر رکھا گیا تھا تو اب دوسرے داماد سے کوئی امتیازی رویّہ کیوں اختیار کیا جائے؟

اس الجھن کو طرفین نے حل کرنے کی صورت یہ سوچی ہے کہ مجلسِ نکاح میں جبکہ ہمارے عزیز کا پہلا داماد موجود ہوگا۔ مہر وہی نو دس ہزار روپیہ تحریر کیا جائے گا۔ مگر بعد میں خفیہ طور پر اس تحریر کو بدل کر نو ہزار سے نو سو کر دیا جائے گا۔ اس طرح نہ پہلا داماد ناراض ہوگا نہ ہمارے چھوٹے بھائی پر بار رہے گا۔

مجھے اس مجوزہ صورتِ معاملہ میں کھٹک سی ہو رہی ہے اور میں نے اس کا اظہار اپنے والد محترم کے سامنے بھی کر دیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ علمائے شریعت سے استصواب کریں، اس پر انھوں نے فرمایا کہ ایک مقامی مفتی صاحب سے استفتا کیا جاچکا ہے اور ان کی رائے میں ایک معاملہ میں جب طرفین راضی ہیں تو شریعت معترض نہیں ہوسکتی اس پر میں نے والد صاحب سے اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا ہے۔

یہی معاملہ جماعتِ اسلامی کے ایک رکن کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا کہ مجوزہ صورتِ معاملہ میں ایک تو پہلے داماد کو فریب دیا جائے گا اور دوسرے دس ہزار مہر کی بہر حال ایک اور مثال عوام کے سامنے قائم کی جائے گی۔ اور رسم و رواج کی بیڑیوں میں گویا ایک اور کڑی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس وجہ سے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا۔

اب مشکل یہ ہے کہ نکاح کی مجلس میں لڑکے کا بھائی ہونے کی وجہ سے مجھے شریک بھی ہونا ہے اور شاید وکیل یا گواہ بھی بننا پڑے اور صورت ایسی ہے کہ میرا ضمیر اس کے جائز ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔ اگر میں بہ حیثیت

وکیل یا شاہد مجلس میں شریک ہوتا ہوں تو از خود اس غلطی میں حصہ دار ہوں۔ جس کو سوچ سمجھ کر میرے اعزہ کرنے لگے ہیں۔ اگر شرکت سے باز رہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ میں بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہوں۔ نیز اگر عدم شرکت کی وجہ مجھ سے پوچھی جائے تو میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں کیونکہ اگر حقیقت بیان کر دوں تو سارا معاملہ درہم برہم ہو کے رہے گا۔

اب براہِ کرم آپ میرے لیے صحیح اسلامی رویہ تجویز فرمادیں انشاءاللہ میں دنیوی تعلقات اور مفاد کو تعمیل میں حائل نہ ہونے دوں گا۔ میں صرف شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اتباع پر تیار ہوں۔ فرار کے لیے کوئی تاویل مجھے مطلوب نہیں ہے۔

جواب:۔

جو معاملہ آپ نے لکھا ہے وہ ایک نمونہ ہے ان غلط کاریوں کا جن میں مسلمان شریعت واخلاق سے دور ہو کر مبتلا ہو گئے ہیں۔ شریعت نے مہر کو عورت کا ایک حق مقرر کیا تھا اور اس کے لیے یہ طریقہ طے کیا تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان جتنی رقم طے ہو اس کا ادا کرنا مرد پر واجب ہے لیکن مسلمانوں نے شریعت کے اس طریقہ کو بدل کر مہر کو ایک رسمی اور دکھاوے کی چیز بنا لیا اور بڑے بڑے مہر کو دکھاوے کے لیے باندھنے شروع کیے۔ جن کے ادا کرنے کی ابتداء ہی سے نیت نہیں ہوتی اور جو خاندانی نزع کی صورت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بلائے جان بن جاتے ہیں۔ اب ان غلطیوں سے بچنے کی سیدھی اور صاف صورت یہ ہے کہ مہر اتنے ہی باندھے جائیں جن کے ادا کرنے کی نیت ہو اور جن کے ادا کرنے پر شوہر قادر ہو پورا مہر بر وقت ادا کر دیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس کے۔ لیے ایک مدت کی قرار داد ہونی چاہیے اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کر دینا چاہیے۔ اس راستی کے طریقہ کو چھوڑ کر اگر کسی قسم کے حیلے نکالے جائیں گے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ ایک غلطی سے بچنے کے لیے دس قسم کی اور غلطیاں کی جائیں گی جو شرع کی نگاہ میں بہت بری اور اخلاق کے اعتبار سے نہایت بدنما ہیں آپ

ایسے نکاح میں وکیل یا گواہ کی حیثیت قبول نہ کریں، بلکہ فریقین کو سمجھانے کی کوشش کریں اور اگر نہ مانیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ نکاح میں شریک ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جھوٹ فریب کا گواہ بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔

(ترجمان القرآن، ذی قعدہ ۶۵ھ۔ اکتوبر ۴۶ء)

لباس اور چہرے کی شرعی وضع

سوال:۔

"مطالبہ کیا جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لیے آدمی کو لباس اور چہرے کی اسلامی وضع قطع اختیار کرنی چاہیے۔ براہ کرم بتائیے کہ اس سلسلے میں اسلام نے کیا احکام دیئے ہیں۔"

جواب:۔

لباس اور چہرے کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب تو میں دیے دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجئے پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے چلے جائیے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی جائے۔ ورنہ مجرد ضابطہ و قانون (RULES AND REGULATION) کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اس نقشہ پر ڈھال لیا جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اندر تقویٰ پیدا نہ ہوا، تو آپ کی مثال ایسی ہوگی جیسے تانبے کے سکّہ پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپہ لگانا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں اس کو لگا سکتے ہیں۔ لیکن زر خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے اور بہت مدت کی کیمیا گری سے یہ چیز

حاصل ہوا کرتی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جارہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشرفی کے ٹھپے کے ساتھ تانبے، لوہے، سیسے اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکے چل پڑے ہیں۔ عملی دنیا کا بازار ایسا بے لاگ صراف ہے کہ وہ زیادہ مدت تک اس جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا کچھ مدت تک تو ہماری دھوکے کی اشرفیاں چل گئیں۔ لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی ان کی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ ہمیں اسلامی جماعت میں جس قسم کی دینداری پیدا کرنی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں۔

لباس اور چہرے کی وضع اور ایسے ہی دوسرے ظواہر کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی ہدایات دی ہیں وہ مدینہ طیبہ کے آخری پانچ چھ برسوں کی ہیں اس سے پہلے پندرہ سولہ سال تک آپؐ اپنے متبعین میں تقویٰ اور احسان کی وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے جن کا مفصل نقشہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بیان ہوا ہے اس ترتیب پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس کو تزکیۂ نفوس کی خدمت پر مقرر فرمایا تھا اس نے بھی پہلے اپنی پوری توجہ مسِ خام کو کندن بنانے ہی پر صرف کی تھی۔ پھر جب کندن بنالیا تب اس پر اشرفی کا نقش مرتسم کیا۔

لیکن اس تقسیم و تاخیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے احکامِ شرعی کی تعمیل سے جی چرانے کا بہانہ بنالیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی متقیانہ وضع بنانے سے پرہیز کیا جائے جس کی تہہ میں واقعی تقویٰ اور خدا ترسی موجود نہ ہو اور جس کے اندر اسلامی اخلاق کی روح مفقود ہو۔

لباس کے متعلق اسلام نے جس پالیسی کا تعین کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایسی وضع میں رہیں جس میں آپ کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکے کہ آپ مسلمان ہیں۔ بحیثیت مجموعی آپ کی وضع قطع کفّار سے مشابہ نہ ہونی چاہیئے۔

ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ اگر آپ ڈاڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور

اتنی ڈاڑھی رکھ لیں جس پر عرف عام میں ڈاڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہے (جسے دیکھ کر کوئی شخص اس شبہ میں مبتلا نہ ہو کہ شاید چند روز سے آپ نے ڈاڑھی نہیں مونڈی ہے) تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ خواہ اہل فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اترے یا نہ اترے۔

سر کے بالوں کے متعلق صرف یہ ہدایت ہے کہ کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ممنوع ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس قسم کے بالوں کو پنجاب میں "بودے" کہتے ہیں اور جنھیں یوپی میں انگریزی بال کہا جاتا ہے ان کے ناجائز ہونے کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی۔ لیکن ایک غیر مسلم قوم کی ایجاد کردہ وضع کو سر چڑھانے میں کراہیت کا پہلو ضرور ہے اور اسی لیے میں نے اس وضع کو بدل دیا ہے۔

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۶۲ھ۔ ستمبر اکتوبر ۴۳ء)

ڈاڑھی کے متعلق ایک سوال

سوال:۔

میں نے ڈاڑھی رکھی ہے میرے کچھ ایسے رشتہ دار جو علم دین سے کافی واقف ہیں۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ ڈاڑھی فرض نہیں ہے۔ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں ملتا۔ ڈاڑھی نہ رکھی جائے تو کون سا گناہ کبیرہ ہے یہ رسولؐ کی سستی محبت ہے۔ آپ فرمائیے کہ میں انھیں کیا جواب دوں؟"

جواب:۔

ڈاڑھی کے متعلق آپ نے جو سوال مجھ سے کیا ہے اس پر ایک انگریز نومسلم کا واقعہ یاد آگیا جس نے اسلام کا اچھا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو قبول کیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ہی اس نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی۔ بعض لوگ جو اسی طرح کے "علم دین سے کافی واقف" تھے۔ جیسے آپ کے یہ عزیز ہیں، کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا اسلام میں کچھ ایسا ضروری کام تو نہیں ہے۔ پھر کیوں خواہ مخواہ آپ نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی؟ اس نے

جواب دیا "میں ضروری اور غیر ضروری کی تقسیم کو نہیں جانتا میں بس یہ جانتا ہوں کہ پیغمبر نے اس کا حکم دیا ہے۔ جب میں نے پیغمبر کی اطاعت قبول کر لی تو حکم بجالانا میرا فرض ہے۔ کسی کے ماتحت کا یہ کام نہیں ہے کہ افسر بالا (HIGHER AUTHORITY) کے احکام میں سے کسی کو ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دے۔" بس یہی واقعہ اپنے عزیزوں کو سنا دیجئے اور ان سے یہ بھی پوچھئے کہ یہ تو خیر رسولؐ کی سستی محبت ہے؛ جناب نے اگر کسی مہنگی محبت کا ثبوت دیا ہو تو ارشاد فرمائیے۔ اگر ایک نوکر آقا کے آسان احکام کی تعمیل سے بھی گریز کرتا ہے تو وہ امور مہتمہ کو کیسے سرانجام دے سکے گا۔ ہم سستی اور مہنگی محبت کا فرق نہیں جانتے۔ ہمیں تو پوری طرح اس راستے پر چلنا ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے ہیں اور ان احکام کی تعمیل کرنی ہے جو آپؐ نے دیے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں ڈاڑھی رکھنا، کسی ایسے شخص کے لیے جو فرنگیت زدہ طبقوں سے تعلق رکھتا ہو، محض ایک حکم نبوی کی تعمیل ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا جہاد بھی ہے اور عجب نہیں کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہجرت کا اجر بھی مل جائے سب سے پہلے تو ان کو خود اپنے اس مذاق اور رنگ طبیعت کے خلاف بہت دنوں تک جدوجہد کرنی پڑتی ہے جو برسوں کی تعلیم و تربیت اور ماحولی اثرات کے تحت اس کے اندر راسخ ہو چکا تھا۔ پھر جب وہ اس پرانے ذوق کی بیخ کنی کرنے اور اس کی جگہ اسلامی ذوق اپنے اندر پرورش کرنے میں اس حد تک کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی اُگ سکے تو باہر ایک دوسری کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ماحول اس سے لڑنے لگتا ہے کہ یہ کیسا انقلاب تیرے اندر رونما ہو رہا ہے۔ اس کے عزیز اقارب، دوست، آشنا سب اسے چھیڑنے لگتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اس پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ شادی کے مارکیٹ میں اس کی قیمت گر جاتی ہے، ہر طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس دیوار کو ڈھاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان اٹھ رہی ہے۔ ان پے در پے حملوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا شخص ٹھہر نہیں سکتا جس میں کیرکٹر کی مضبوطی نہ ہو۔ یا جس میں اندرونی

تغیر کے مکمل ہونے سے پہلے کسی وقتی جذبے کے اثر یا کسی خارجی دباؤ سے بیرونی تغیر شروع ہو گیا ہو۔ ایسا شخص تھوڑا یا بہت مقابلہ کرنے کے بعد آخر کار اپنے ماحول سے شکست کھا جاتا ہے اور بہروپیوں کی طرح پھر وہی وضع اختیار کر لیتا ہے جسے چھوڑنے کی اس نے نمائش کی تھی۔ مگر جو مضبوط کیریکٹر رکھتا ہو اور جس کا باطنی انقلاب پائدار بنیادوں پر اٹھا ہو وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس مقابلہ میں ڈٹ جاتا ہے اور اس استقامت کے نتیجہ میں دو زبردست فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اس کے اندر موجودہ کافرانہ ماحول کے خلاف دوسرے میدانوں میں بھی کامیاب لڑائی لڑنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے دوسرے یہ کہ جس مضبوط سیرت کا اس نے ثبوت دیا ہے اس کا رعب اس کے ماحول پر طاری ہو جاتا ہے اور اس کی تبلیغ و تلقین میں اتنا وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی سوسائٹی کے دوسرے اصلاح پذیر لوگوں پر وہ اثر ڈال سکے۔

اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اس زمانہ میں منڈی ہوئی ڈاڑھی محض ایک وضع نہیں ہے بلکہ ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کا نمایاں ترین شعار ہے۔ اس شعار کو چھوڑنا دراصل اس کلچر اور اس مذہب زندگی کو چھوڑنے کا اعلان ہے جس کا یہ شعار ہے اور ڈاڑھی رکھنا کم از کم موجودہ حالات میں تو عملاً اسلام کو ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کا ہم معنیٰ ہے یہ ترک و اختیار اس وقت تک حقیقی اور پائدار نہیں ہو سکتا جب تک فی الواقع آدمی کے نفس میں مغربی کلچر اور مذہب زندگی کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے اور اس کی جگہ اسلامی کلچر اور مذہب زندگی کی جڑیں اچھی خاصی مضبوط نہ ہو جائیں لہٰذا جو لوگ محض سطحی طور پر اخلاقی دباؤ ڈال کر جدید طرز کے نوجوانوں سے ڈاڑھی رکھوانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اندرونی انقلاب چاہے ہو یا نہ ہو مگر بیرونی انقلاب سے ضابطہ کی خانہ پری فوراً کر دی جائے وہ بیچارے حقائق سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مگر جہاں یہ تغیر فی الحقیقت ایک گہرے اندرونی انقلاب کا نتیجہ ہو اور اس کے متوازی متقیانہ سیرت کے دوسرے مظاہر بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہو رہے ہوں اور ماحول کے غیر اسلامی اثرات سے لڑنے میں

بھی یا مردی کا ثبوت دیا جا رہا ہو ایسی جگہ اس انقلاب کو محض ایک معمولی چیز قرار دینا اور اسے رسولؐ کی سستی محبت سے تعبیر کرنا صرف انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو بیچارے رخسار و ذقن کے بالوں سے زیادہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۶۲ھ ستمبر اکتوبر ۴۳ء)

ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال:۔

ڈاڑھی کی مقدار کے عدم تعیین پر "ترجمان" میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مجھے تشویش ہے کیونکہ بڑے بڑے علماء کا فتویٰ اس پر موجود ہے کہ ڈاڑھی ایک مشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اس سے کم ڈاڑھی رکھنے والا فاسق ہے۔ آپ آخر کن دلائل کی بنا پر اس "اجماعی فتویٰ" کو رد کرتے ہیں؟

جواب:۔

یہ تو انہی علماء سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس مقدار کے تعین کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً "فسق" کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بناء پر ان کی تعین کردہ مقدار سے کم ڈاڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ "بڑے بڑے علماء" خود حدود شرعیہ کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدود شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

ڈاڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے علماء نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے وہ بہرحال ایک استنباطی چیز ہے اور کوئی استنباط کیا ہوا حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جا سکتا ہے تو صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جا سکتا ہے۔ حکم مستنبط کی خلاف ورزی (چاہیے استنباط کیسے ہی بڑے علماء کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی۔ ورنہ اسے فسق قرار دینے

کے دوسرے معنیٰ یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

سوال:۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی ڈاڑھی ایک مشت سے کم تھی؟

جواب:۔

اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی ڈاڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہ کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں مگر ان کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ ان کی ڈاڑھی کتنی تھی۔ اس وجہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور ناقابلِ توجہ تھا۔ حالانکہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جاتا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت و کردار میں پہلی چیز جس کی جستجو ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ اس کی ڈاڑھی کا طول کتنا ہے۔

سوال:۔

ڈاڑھی کی مقدار کے عدم تعین کا جو مسئلہ جماعتِ اسلامی میں پھیل نکلا ہے اس کے ماتحت بعض رفقاء نے اپنی ڈاڑھیاں پہلے سے چھوٹی کرالی ہیں۔ اور اب ان خشخشی ڈاڑھیوں کے متعلق یہ خدشہ ہے کہ کہیں "احمدی ڈاڑھی" کی طرح ان کا بھی کوئی فرقی نام نہ پڑ جائے اور عوام کے لیے یہ چیز فتنہ نہ ثابت ہو۔ چونکہ علماء کا متواتر تعامل مشت بھر ڈاڑھی رکھنے کا ہے اس وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اس کا التزام کرنا چاہیے۔

جواب:۔

آپ کا قلب جس چیز پر گواہی دے آپ کو خود اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اسی چیز کو دوسروں کے لیے ضابطہ بنانے کی خواہش نہ ہونی چاہیے میرے نزدیک کسی کے ڈاڑھی کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا اصل چیز جو آدمی کے ایمان کی کمی اور بیشی پر دلالت کرتی ہے وہ تو اور ہی ہے البتہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ

جس طرح ایمان کی کمی کو بعض ظاہری چیزوں کی کمی بیشی سے پورا کرنے کی اب تک کوششیں کی جاتی رہی ہیں، کہیں جماعتِ اسلامی کے بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر کسی کی حقیقی جاں نثاری و وفاداری اللہ کی راہ میں "طویل" ہو تو کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے گا۔ اگر اس کی ڈاڑھی "قصیر" ہو۔ لیکن اگر جاں نثاری و وفاداری "قصیر" ہے تو یاد رکھیے کہ ڈاڑھی کا طول کچھ بھی فائدہ نہ دے گا بلکہ بعید نہیں کہ خدا کے ہاں اس فریب کاری اور مکاری کا مقدمہ چل جائے۔

آپ اس کی فکر نہ کیجئے کہ ہماری جماعت کے ارکان کے متعلق لوگ کیا رائے قائم کریں گے اور ان کے ظاہر سے کیا اثر لیں گے آپ کو اور ہمارے تمام رفقاء کو اپنے باطن کی فکر اپنے ظاہر سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور اسی طرح اپنے ان اعمال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے جن پر خدا کی میزان میں آدمی کے ہلکے یا بھاری ہونے کا مدار ہے۔ کیونکہ اگر ایسے اعمال ہلکے رہ گئے تو بال برابر وزن رکھنے والی چیزوں کی کمی بیشی سے میزانِ الٰہی میں کوئی خاص فرق واقع ہونے کی توقع نہیں ہے[1]

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل۔ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ مارچ، جون ۱۹۴۵ء)

فوٹو کا مسئلہ

سوال:۔

میرے ایک فوٹو گرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو اعتنائی حکم دیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے۔ کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے؟

---

[1] اس مسئلہ پر مزید بحث آگے "خلافیات" کے باب میں آ رہی ہے۔

جواب :-

فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنہ کی موجب بنی ہے۔ اب چونکہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس کو کس طریقہ سے محفوظ کیا جاتا ہے طریقہ خواہ سنگتراشی ہو یا موقلم یا عکاسی یا اور کوئی جو آئندہ ایجاد ہو بہر حال وہ ناجائز ہی رہے گا۔ کیونکہ یہ سارے طریقے اصل فتنے کا سبب بننے میں یکساں ہیں پس فوٹو گرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور ممانعت چونکہ جاندار اشیاء کی تصویروں کی ہے اس لیے تمام تصویریں حرام رہیں گی۔ خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثناء ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو، یا جب کہ تصویر کسی بڑی مصلحت کے لیے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لیے تصویریں محفوظ کرنا، ڈاکٹروں کا علاج کے لیے یا فنِ طب کی تعلیم کے لیے مریضوں کی تصویریں لینا اور جنگی اغراض کے لیے فوٹو گرافی کا استعمال[1]۔ یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے استعمالات حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائیں گے۔ بشرطیکہ وہ غرض جس کے لیے اس استثناء سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔ بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوس کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگانِ خدا کو اس خطرہ سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ کانگریس

---

[1] یہ استثناء اسی اصول پر مبنی ہے جس کی بنیاد پر علمائے سلف نے لڑکیوں کی تربیت اور کھیل کے لیے گڑیوں کے استعمال کی اجازت دی ہے اور جس کا ثبوت ملتا ہے۔

کے اجلاس میں گاندھی جی کا باون فٹ لمبا فوٹو، یہ پولینڈ پر روسی قبضہ کے بعد ہی اسٹالن کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا، یہ روس میں ہر جگہ اسٹالن اور پولٹ بیورو کے ارکان کی تصویروں کا لوگوں کے سروں پر مسلّط رہنا، یہ جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور ہسپتالوں میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، یہ سنیما میں شاہ انگلستان کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، یہ سکّوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا، کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں ہیں؟ آخر اسی لیے تو اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا کسی دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔ میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لیے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنہ کی موجب بن جائے۔ کنھیا جی کے بچپن کی تصویر آج تک پُج رہی ہے۔ لہٰذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کریں اور اگر یہی کام کرنا چاہتے ہیں تو اسے خواہ مخواہ حلال بنانے کی کوشش نہ کریں، اخلاقی تنزل کا بدترین مرتبہ یہ ہے کہ آدمی جس گناہ میں مبتلا ہو اُسے جھوٹی تاویلوں سے ثواب ٹھیرا لے۔ اس گڑھے میں گرنے کے بعد پھر آدمی کے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

سوال:۔

انٹرنس کے امتحان میں پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت امتحان کے لیے درخواست کے ہمراہ فوٹو ارسال کرنا لازمی ہے، پھر کیا ایسی صورت میں فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ العلماء، نے اس صورت کو جائز فرمایا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جائز کیونکر ہو سکتا ہے؟

جواب:۔

اس معاملہ میں مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب کے فتوے سے اتفاق ہے۔ فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو۔ وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے امتحانات کے سلسلہ میں چونکہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکا دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لیے بھیج دیتے ہیں اس لیے درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے پورا کرنا مشکل ہے اور دھوکے اور فریب کا سدباب بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے تصویر کھنچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، تفتیش جرائم، طبی تحقیقات وضروریات جہاد اور ناگزیر تعلیمی اغراض کے لیے بھی فنِ تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصول فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحضورات یعنی انسان کی حقیقی ضروریات کے لیے وہ چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں جو بجائے خود ناجائز ہیں۔

(ترجمان القرآن رجب، شعبان ۶۲ھ، جولائی، اگست ۴۳ء)

نواقضِ وضو

سوال:۔

اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے، اس کی قدر و قیمت سے عقل انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بعض جزئیات بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا۔ حالانکہ جسم کے ایک حصہ سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر کوئی ایسی نجاست نہیں ہے جس سے وضو ساقط ہو جائے آخر اس ہوا سے کیا چیز گندی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پیشاب کرنے سے وضو کا سقوط، حالانکہ اگر احتیاط سے پیشاب کیا جائے اور پھر اچھی طرح دھو لیا جائے تو کہیں کوئی

نجاست لگی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال دوسرے نواقضِ وضو کا ہے جس سے وضو ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ براہِ کرم اس الجھن کو اس طرح دور کیجئے کہ مجھے عقلی اطمینان حاصل ہو جائے؟"

جواب :-

نواقضِ وضو کے مسئلے میں آپ کو جو شبہات پیش آئے ہیں انھیں اگر آپ حل کرنا چاہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ شریعت میں جن جن باتوں سے وضو کے ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کا حکم لگایا گیا ہے پہلے ان سب کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔ پھر خود اپنے طور پر سوچیے کہ عام انسانوں کے لیے (جن میں عالم اور جاہل، عاقل اور کم عقل، طہارت پسند اور طہارت سے غفلت کرنے والے سب ہی قسم کے لوگ مختلف درجات و حالات کے موجود ہیں) آپ کو ایک ایسا ضابطہ بنانا ہے جس میں حسب ذیل خصوصیات موجود ہوں۔

(۱) لوگوں کو بار بار صاف اور پاک ہوتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان میں نظافت کی حِس اس قدر پیدا کر دی جائے کہ وہ نجاستوں اور کثافتوں سے خود بچنے لگیں۔

(۲) خدا کے سامنے حاضر ہونے کی اہمیت اور امتیازی حیثیت ذہن میں بٹھائی جائے تاکہ نیم شعوری طور پر آدمی خود بخود اپنے اندر یہ محسوس کرنے لگے کہ نماز کے قابل ہونے کی حالت دنیا کی دوسری مشغولیتوں کے قابل ہونے کی حالت سے لازماً مختلف ہے۔

(۳) لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے حال کی طرف توجّہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ اپنے پاک یا ناپاک ہونے اور ایسے ہی دوسرے احوال سے جو ان پر وارد ہوتے رہتے ہیں بے خبر نہ ہونے پائیں اور ایک طرح سے خود اپنے وجود کا جائزہ لیتے رہیں۔

(۴) ضابطہ کی تفصیلات کو ہر شخص کے اپنے فیصلہ اور رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ایک طریق کار معین ہو تاکہ انفرادی طور پر لوگ طہارت میں افراط و تفریط نہ کریں۔

(۵) ضابطہ اس طرح بنایا جائے کہ اس میں اعتدال کے ساتھ طہارت کا مقصد حاصل

ہو نہ اتنی سختی ہو کہ زندگی تنگ ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی نرمی کہ پاکیزگی ہی باقی نہ رہے۔

ان پانچ خصوصیات کو پیشِ نظر رکھ کر آپ خود ایک ضابطہ تجویز کریں اور خیال رکھیں کہ اس میں کوئی بات اس نوعیت کی نہ آنے پائے جس پر وہ اعتراضات ہو سکتے ہوں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

اس قسم کا ضابطہ بنانے کی کوشش میں اگر آپ صرف ایک ہفتہ صَرف کریں گے تو آپ کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آجائے گی کہ ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر صفائی و طہارت کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا جس پر اس نوعیت کے اعتراضات وارد نہ ہو سکتے ہوں جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ آپ کو بہر حال کچھ چیزیں ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہوگا۔ آپ کو یہ بھی متعین کرنا ہوگا کہ ایک طہارت کی مدتِ قیام (DURATION) کن حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔ اس غرض کے لیے جو حدیں بھی تجویز کریں گے ان میں ناپاکی ظاہر اور نمایاں اور محسوس نہ ہوگی۔ بلکہ فرضی اور حکمی ہی ہوگی۔ اور لامحالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہوگا۔ پھر آپ خود غور کیجئے کہ آپ کی تجویز کردہ حدیں ان اعتراضات سے کس طرح بچ سکتی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

جب آپ اس زاویۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو آپ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ شارع نے جو ضابطہ تجویز کر دیا ہے وہی ان اغراض کے لیے بہترین اور غایت درجہ معتدل ہے۔ اس کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت و معلول اور سبب و مسبب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا بحیثیت مجموعی ان اغراض و مصالح کے لیے جو اوپر بیان ہوئی ہیں اس سے بہتر اور جامع تر کوئی ضابطہ تجویز کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کو احکام وضو میں جو غلط فہمی پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس بنیادی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو بحیثیت مجموعی ان احکام میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ ایک ایک جزئی حکم کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتے

ہیں کہ فلاں فعل میں آخر کیا بات ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی ضرب آخر کس طرح شکست وضو کا سبب بن جاتی ہے۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

آلات کے ذریعہ توالُد وتناسل

سوال:-

کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائے گی اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال رکھیے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹیفک طریقوں سے اپنے حصہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کردے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔"

جواب:-

آلات کے ذریعہ استقرار حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرادی جائے۔ آخر انسان کی صنفِ اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجئے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد وتناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لطف حاصل نہیں کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی "مادہ" کے ساتھ بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و صنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارہ نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے، فطرتِ الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان میں مودّت اور رحمت ہو، حسنِ معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشوونما حاصل کرے اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ (النساء: ۱۱۹) اللہ کی بنائی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے۔ جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قیدِ نکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہو گا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا۔ جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجئے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہو گا صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لیے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے آدھے ساقط کر دیئے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری تو قائم رہے گی مگر مرد ہمیشہ کے لیے باپ ہونے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے "امتحانی

نلیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اسے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے اس کے ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہوگی۔

یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیدا آوری" (MASS PRODUCTION) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے۔ جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہوگا۔ ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات کی خوبو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادّہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں، اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصوّر کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

مشینی امامت

سوال:۔

ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے جو ایک شخص کی آواز کو سیکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کرلیا جاتا ہے اور پھر اسے خاص طریقوں سے دہرایا جاسکتا ہے۔ سوال

یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے پر بذریعہ ریڈیو امامت کرائے یا کسی امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کر لیا گیا ہو اور اسے دہرایا جائے تو کیا ان آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہے؟"

جواب:۔

ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا یا گراموفون کے ذریعہ نماز کا ریکارڈ بنانا اور پھر کسی جماعت کا اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے اس کے وجوہ آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرے۔ ان کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھے اور حسب موقع و ضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح و ارشاد کے فرائض انجام دے، یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارہ میں بھی اب انحطاط رونما ہو گیا ہے۔ لیکن بہرحال نفسِ ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت و خطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصل روح ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض "پوجا" نہیں ہے لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کر دینا اور اس میں "مشینیت" پیدا کر دینا دراصل اس کی قدر و قیمت ضائع کر دینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعہ سے امامت و خطابت کے فرائض انجام دے اور مقامی اماموں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانیت ہوگی جو اسلام کی جمہوری روح کو ختم کر دے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز ان نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے، جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر

کا بالکلیہ تابع بنا دینے کا اصول اختیار کیا گیا ہے جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اس کے ہاتھوں میں چلی جائے اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشو و نما نہ پا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرنِ خیر القرون میں "امام" محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کرا دینا ہو بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کا کام تعلیم و تزکیہ اور اصلاحِ تمدن و معاشرت تھا اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا تھا۔ کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح و بہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے بلکہ مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ "مشینی امامت" اسلام کی روح کے بالکل خلاف ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ جنوری، فروری ۴۴ء)

اسلام اور آلات موسیقی

سوال:۔

(۱) کیا آلات موسیقی بنانا اور ان کی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہے، نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود تو ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوف کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں۔

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں

آلات موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو۔

(۵) آلات لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آں حضورؐ کے زمانہ میں دف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا اور آپؐ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے لہٰذا ہمارے زمانے میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں ناروا ہو؟

(۶) کیا دف آلاتِ لہو میں شامل ہے؟

جواب:۔

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔" اب یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ جو نبیؐ اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیرو انہی آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانے کسی حال میں درست نہیں۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے مواقع پر دف کے ساتھ کچھ گا بجا لیا جائے۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے جو رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہوں ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط و ضبط نہ رکھیں جنھیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں۔ ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ جب تمہاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی انھیں کا ساتھ نصیب ہوگا۔

(۴) جواب نمبر ۳ ملاحظہ ہو۔ مگر خیال یہ رہے کہ مجلسِ نکاح میں جب کہ ایجاب و قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی و شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائز کاموں

کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اس زمانہ میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہلِ محض ہو۔ وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دف کا نام اگر آلاتِ موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدمی جا سکتا ہے، اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اس نبیؐ کے پیروؤں میں اپنا نام لکھوائے جو آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

عذرِ مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت

سوال:۔

ایک شخص غیر اللہ مثلاً بادشاہ یا حکومت باطلہ کی اطاعت کرتا ہے اور اعتقاداً بھی اسی کو حق سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اعتقاداً تو اس کی بندگی نہیں کرتا لیکن عملاً اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے لیے مجبوری کا عذر پیش کرتا ہے، کیا ان دونوں کے عمل میں کوئی تفریق کی جا سکتی ہے۔ آپ کی تفسیر الٰہ و رب کے لحاظ سے تو دونوں ایک ہی درجے میں ہوئے۔ حالانکہ دونوں میں "بُعد المشرقین ہے"۔

جواب:۔

میں اپنے مضامین میں کئی جگہ اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ تمام انسان حسب ذیل چار طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں:۔

الف۔ مومن بالغیر ومسلم للغیر۔ یعنی جو غیر اللہ کو مطاع برحق اور ماخذ امر اعتقاداً بھی مانتے ہیں اور عملاً اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں یہ مکمل کافر ہیں۔

ب۔ مومن بالغیر ومسلم للہ۔ یہ پوزیشن ذمیوں کی اور ایک حد تک منافقوں کی ہے۔

ج۔ مومن باللہ ومسلم للغیر۔ یعنی اللہ کو اعتقاداً مطاع برحق ماننے والے مگر عملاً غیر اللہ کی اطاعت وبندگی بجالانے والے۔ یہ پوزیشن ان مسلمانوں کی ہے جو کفار کے تابع فرمان ہو جائیں۔ اس حالت میں اگر مسلمان مبتلا ہو تو اسے اس پر نہ راضی ہونا چاہیے نہ مطمئن رہنا چاہیے بلکہ اس کا فرض ہے کہ یا تو اس حالت کو بدلنے کی کوشش کرے یا اس سے نکل جائے۔

د۔ مومن باللہ ومسلم للہ۔ یہی اصل مسلمانوں کی پوزیشن ہے اور قرآن کی دعوت تمام انسانوں کو یہی ہے کہ وہ یہ پوزیشن اختیار کرنے کی سعی کریں۔ اس پوزیشن میں کوئی رخنہ اس وجہ سے واقع نہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی غیر مسلم نظام میں مجبوراً اپنی کسی کوتاہی سے نہیں بلکہ حالات کے جبر سے گرفتار ہو جائے جس طرح مکہ معظمہ میں مسلمان تھے۔ یا جس طرح بہت سے صحابۂ کرامؓ کفار کے ہاتھوں اسیر ہوئے یا جیسا کہ اکثر انبیاءؑ کا حال رہا ہے۔ جو نظام کفر ہی میں پیدا ہوئے۔ اس طرح کی مجبورانہ گرفتاری اسلام لغیر اللہ کی تعریف میں نہیں آتی۔ کیوں کہ اول تو یہ چیز ان کی اختیار کردہ یا قبول کردہ نہ تھی بلکہ ان پر مسلط شدہ تھی دوسرے جب کوئی شخص مومن باللہ وکافر بالغیر ہو چکا ہو اور اس کے ساتھ جس نے اپنی حد تک مسلم للہ ہونے اور عاصی للغیر ہونے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو اس پر مسلم للغیر ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

نیز یہ بات یقینی ہے کہ طبقہ ’ج‘ کی پوزیشن طبقہ ’ا‘ اور ’ب‘ کے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ مومن باللہ ومسلم للغیر مشرک اور کافر ہرگز نہیں ہیں لیکن اگر وہ اس حالت

پر راضی ہیں یا اسے بدلنے اور اس سے نکلنے کی امکانی سعی نہیں کرتے تو سخت گناہ گار ہیں، ایسے گناہ گار کہ ان کی ساری زندگی گناہ بن کر رہ جاتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ جنوری، فروری ۴۵ء)

خدا کے حضور دعا میں ہاتھ اٹھانا

سوال :۔

مقامی حلقوں میں میرے خلاف بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے مسلک کے پیروؤں کی ہے جن کا امتیازی شعار ہی یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔ یہ حضرات میرے خلاف اپنے اعتراض میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجہ اخفا برتا جائے۔ بخلاف اس کے ہاتھ اٹھانے سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ بدیں وجہ دعا میں ہاتھ اٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔ اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب نہیں ہوتا وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں، چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ میں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ تو جاہلیت کے کرشمے ہیں مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلے کو سمجھنا ہے۔

جواب :۔

ان حضرات سے دریافت کیجئے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے) کا اگر وہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز

کے لیے بلند آواز سے اذان، پھر علانیہ مسجدوں میں لوگوں کا مجتمع ہونا، پھر جماعت سے نماز پڑھنا، پھر نماز میں جہری قراءت کرنا پھر یہ سب کچھ بھی تو اس آیت کے خلاف قرار پائے گا۔ نماز اصل میں تو ایک دعا ہی ہے۔ اگر دعا کے لیے اخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں ہونی ہی نہ چاہیے تو ظاہر ہے کہ نماز با جماعت کی پوری صورت ہی اس کے خلاف ہے۔

پھر جو کچھ یہ حضرات فرماتے ہیں، وہ حدیث کے بھی خلاف ہے۔ حدیث میں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہو کر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ :۔

ان ربکم حیی کریم	تمہارا رب بڑا باحیا اور کریم ہے بندہ
یستحی من عبدہ	جب اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے
اذا رفع یدیہ ان	تو اسے شرم آتی ہے کہ اس کو خالی
یردھما صفراً۔ (سنن ترمذی)	ہاتھ واپس کر دے۔

دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیتے تھے حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا اللہ کے آگے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا جو اب رائج ہے کہ نماز باجماعت کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگتے ہیں، اس بنا پر بعض علماء نے اس طریقے کو بدعت ٹھیرایا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر اس کو لازم نہ سمجھ لیا جائے اور اگر نہ کرنے والے کو ملامت نہ کی جائے اور اگر کبھی کبھی قصداً اس کو ترک بھی کر دیا جائے تو پھر اسے بدعت قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، خدا سے دعا مانگنا بجائے خود تو کسی حال میں برا فعل نہیں ہو سکتا۔ (ترجمان القرآن۔ ربیع الاول، جمادی الثانی ۶۴ھ مارچ، جون ۴۵ء)

کرب کا علاج بذریعہ موت

سوال:۔

اگر کسی مریض کے جاں بر ہونے کی قطعاً امید نہ رہی ہو اور شدّتِ مرض کی وجہ سے وہ انتہائی کرب میں مبتلا ہو۔ یہاں تک کہ نہ غذا اندر جاتی ہو نہ دوا۔ تو کیا ایسے حالات میں کوئی طبیب حاذق اس کو تکلیف سے نجات دینے کے لیے کوئی زہر دے کر اس کی زندگی کی دردناک گھڑیاں کم کر سکتا ہے۔ اس قسم کی موت وارد کرنے سے کیا اس پر شرعاً قتل کا الزام آئے گا۔ حالانکہ اس کی نیت بخیر ہے۔

جواب:۔

یقیناً اس پر قتل کا الزام آئے گا۔ اس معاملہ میں نیت کے بخیر ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس جان کا وہ مالک نہیں ہے اور جس کے خلاف کوئی شرعی حق بھی قائم نہیں ہوا ہے۔ اس کو اگر اس نے قصداً ہلاک کیا ہے تو وہ قطعی طور پر قتلِ عمد کا مجرم ہے۔

طبیب کو اللہ نے جو علم دیا ہے اس کی غرض انسانی جان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا ہے نہ کہ اس کی موت کے لیے۔ جب تک کسی شخص کے اندر زندگی موجود ہو۔ طبیب کا فرض ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کرتا رہے اور جس حد تک اس کے امکان میں ہو اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے بھی سعی کرے۔ لیکن یہ بات ایک طبیب کے اخلاقی و شرعی حدودِ عمل سے بالکل خارج ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کون آدمی ہلاک کر دیئے جانے کا مستحق ہے بلکہ یہ بات خود اس مریض کے اپنے حدودِ اختیار سے بھی باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرے اس لیے اگر مریض کا اپنا مطالبہ بھی ہو تب بھی طبیب کے لیے ایسا کوئی فعل ہرگز جائز نہیں ہے جو اسے ہلاک کرنے کی خاطر ہو۔

علاوہ بریں یہ بھی ایک قطعی مفروضہ ہے کہ کوئی ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں

یہ بالکل یقین کے ساتھ جان سکتا ہے کہ وہ ضرور مر جائے گا۔ ایسی مثالیں نادر نہیں ہیں جن میں ایک طبیب نے نہیں بلکہ متعدد طبیبوں نے بالاتفاق رائے قائم کی ہے کہ مریض نہیں بچے گا اور پھر ان کے اندازوں کے بالکل خلاف اس کی جان بچ گئی ہے۔ اس لیے جو ڈاکٹر محض اندازے سے کسی شخص کے جانبر نہ ہونے کا فیصلہ کرے گا اور اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے اسے ہلاک کر دے گا۔ وہ دراصل ایک بہت بڑا مظلمہ اپنی گردن پر لے گا۔ اپنے علم پر ایسا بے جا اعتماد ایک کافر ڈاکٹر تو کر سکتا ہے مگر یہ ایک مسلمان ڈاکٹر کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن محرم ۶۵ھ، دسمبر ۴۵ء)

سفر میں قصرِ صلوٰۃ

سوال :۔

(ا) قصرِ صلوٰۃ انگریزی میلوں کے حساب سے کتنے لمبے سفر میں واجب ہے؟

(ب) کیا یہ فاصلہ ایک طرفہ سفر کے لیے ہے یا آمد و رفت کی دوہری مسافت بھی شمار ہوگی؟

(ج) کیا ایک مقررہ حلقہ میں سفر کرنے پر بھی یہ رعایت حاصل ہوگی؟

جواب :۔

(ا) فقہاء کی آراء اس معاملہ میں مختلف ہیں، چنانچہ قصرِ صلوٰۃ کے لیے کم از کم ۹ میل اور زیادہ سے زیادہ ۴۸ میل کا نصابِ سفر مقرر کیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملہ میں کوئی صریح ارشاد منقول نہیں ہے۔ اور نصِ صریح کی غیر موجودگی میں جن دلائل سے استنباط کیا گیا ہے ان کے اندر مختلف اقوال کی گنجائش ہے صحیح یہ ہے کہ قصر کے لیے مسافت کا ایسا تعین جس میں ایک نقطۂ خاص سے تجاوز کرتے ہی قصر کا حکم لگایا جا سکے۔ شارع کا منشاء نہیں ہے۔

شارع نے سفر کے مفہوم کو عرفِ عام پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ہر شخص خود بآسانی جان سکتا ہے کہ کب وہ سفر میں ہے اور کب وہ سفر میں نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اگر ہم شہر سے تفریح کے لیے نکلتے ہیں یا گاؤں سے خرید و فروخت کے لیے شہر جاتے ہیں تو کبھی مسافر ہونے کا احساس ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے جب واقعتاً سفر در پیش ہوتا ہے تو ہم مسافرت کی کیفیت خود محسوس کرتے ہیں، اسی احساس کے مطابق قصر اور اتمام کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کا فتوائے قلب معتبر ہے جو شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو نہ کہ بہانہ بازی کا۔

(ب) اس حصّہ کا جواب اوپر ہی کی سطور میں موجود ہے۔ ویسے جن فقہاء نے مقدارِ سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پیشِ نظر یک طرفہ مسافت تھی۔

(ج) ہاں مقررہ حلقہ میں سفر کرنے کی شکل میں بھی قصر صلوٰۃ کرنا چاہیے جس طرح اس حلقہ سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔

(ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ

سوال:-

مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کو روک دے تو اسلام کی نگاہ میں کوئی قیامت نہیں آجاتی۔ خصوصاً جب کہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہاں گیر، شاہ جہاں اور موجودہ نظام حیدر آباد نے عملی مثالیں اس سلسلے میں قائم کی ہیں؟

جواب:- آپ نے جن بڑے بڑے "اماموں" کا نام لیا ہے مجھے ان میں سے کسی

کی تقلید کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو راضی کرنے کے لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے وہ کائناتی قیامت نہ آجائے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آجائے گی افسوس یہ ہے کہ آپ لوگوں کا نقطۂ نظر اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ آپ کے نزدیک اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ کسی طرح دو قوموں کے درمیان اختلاف و نزاع کے اسباب دور ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک اصل اہمیت یہ امر رکھتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کرنے والوں کو شرک کے ہر ممکن خطرہ سے بچایا جائے۔

جس ملک میں گائے کی پوجا نہ ہوتی ہو اور گائے کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں تو گائے کی قربانی محض ایک جائز فعل ہے جس کو اگر نہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جہاں گائے معبود ہو اور تقدس کا مقام رکھتی ہو وہاں تو گائے کی قربانی کا حکم ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں کچھ مدت تک مسلمان مصلحتاً گائے کی قربانی کو ترک کر دیں اور گائے کا گوشت بھی نہ کھائیں تو یہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی ہمسایہ قوموں کے گاؤ پرستانہ عقائد سے وہ متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح بیٹھ جائے گا جس طرح مصر کی گاؤ پرست آبادی میں رہتے رہتے بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا کہ "اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ" پھر اس ماحول میں جو ہندو اسلام قبول کریں گے وہ چاہے اسلام کے اور دوسرے عقائد قبول کریں۔ لیکن گائے کی تقدیس ان کے اندر بدستور موجود رہے گی۔ اسی لیے ہندوستان میں گائے کی قربانی کو میں واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک کسی نو مسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھالے۔ اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ "جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے ہیں اور جس نے اسی قبلہ کو اختیار کیا جو ہمارا ہے اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا وہ ہم میں سے ہے۔" "ہمارا ذبیحہ کھایا" دوسرے الفاظ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام و قیود اور بندشوں کا توڑنا

بھی ضروری ہے جن کا جاہلیت کی حالت میں کوئی شخص پابند رہا ہو۔

(ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

جبری امتناع کی صورت میں مباحات کا وجوب

سوال:۔

ہمارے مقامی خطیب صاحب نے ایک وعظ میں یہ فرمایا ہے کہ اگر کسی ملک میں جبراً گاؤکشی بند کردی جائے تو اس صورت میں ملک کے مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس حکم امتناعی کی خلاف ورزی کریں۔ یہ فتویٰ مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ آخر شریعت نے جن چیزوں کو حلال ٹھیرایا ہے وہ بس حلال ہی تو ہیں۔ واجب کیسے ہوگئیں۔ مثلاً اونٹ کا گوشت کھانا حلال ہے لیکن اگر کوئی نہ کھائے تو گناہ گار نہیں ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حلت کے معنی وجوب کے نہیں ہیں۔ پھر یہ مولوی صاحب فرضیت کا فتویٰ کہاں سے دیتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ مذکورہ بالا فتویٰ کی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۔

یہ بات تو بہت صحیح ہے کہ جب کسی مباح چیز کو کوئی حکومت یا کوئی طاقت زبردستی حرام قرار دے دے تو اس کی قائم کی ہوئی حرمت کو تسلیم کرنا گناہ ہے اور اس کو توڑ دینا واجب ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جو حضرات چھوٹے چھوٹے مباحات کے معاملہ میں شریعت کے اس حکم سے واقف ہیں۔ ان کو یہ یاد کیوں نہیں آتا کہ جس نظام حکومت میں وہ رہتے ہیں اس نے حرام وحلال قرار دینے کے پورے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور نماز روزہ اور نکاح وطلاق کے چند مسائل کو چھوڑ کر خدا کی پوری شریعت کو منسوخ کردیا ہے۔ اگر گاؤکشی کی ممانعت پر گاؤکشی مباح کے بجائے فرض

ہو جاتی ہے تو پوری شریعت کی تنسیخ پر کیا کچھ فرض ہو جاتا ہوگا۔ یہ ان مولوی صاحب سے پوچھیے۔

شریعت اسلامی کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ زندگی میں اپنا پورا غلبہ بلا شرکت غیرے چاہتی ہے اور اگر غیر اللہ کا کوئی اقتدار انسانوں پر اپنا دامن پھیلانا چاہتا ہو تو اسلامی شریعت اپنے متبعین کو اس کا باغی دیکھنا چاہتی ہے نہ کہ مطیع و وفا شعار۔ جس نظام حق کو گائے کی قربانی جیسے معمولی مسئلہ میں غیر اللہ کی مداخلت گوارا نہیں ہے وہ آخر اسے کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ سیاست اور معیشت اور معاشرت کے اہم مسائل میں خدا سے سرکشی کرنے والی کوئی قوت اپنی مرضی کو اللہ کے بندوں پر نافذ کرے۔

شریعت اسلامی کی یہی اسپرٹ ہمیشہ نظام کفر و جاہلیت کے خلاف ارباب حق کو صف آرا کرتی رہی ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری ہوتی رہی ہے کہ میری امت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم۔ یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدید اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوفناکیوں کے آگے جھک جانے سے روکا ہے۔

مگر جہاں یہ اسپرٹ مسلمانوں میں کمزور ہو گئی ہے وہاں انھوں نے اپنی اسلامیت میں کتر بیونت کر کے ہر قسم کے نظامہائے طاغوت کو نہ صرف یہ کہ گوارہ کر لیا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ اسے چلانے اور مستحکم رکھنے اور اس کا تحفظ کرنے کی خدمات تک سرانجام دینے کے لیے تاویلیں کر لی ہیں۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ گاؤکشی اگر طاغوت کی روک سے مباح کے بجائے واجب ہو جاتی ہے تو پھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام کا قائم کرنا جو پہلے ہی فرض اور بہت بڑا فرض ہے باطل کی طرف سے کسی مزاحمت کے پیدا ہو جانے پر دین کے ہر فرض سے بڑا فرض ہو جاتا ہے اور اس سے چشم پوشی کر کے اگر مسلمان ہزار نفلی عبادتیں بھی کرے تو وہ بے معنی ہیں۔

در حقیقت کسی غیر الٰہی طاقت کی مداخلت فی الدین چاہے کتنے ہی چھوٹے معاملہ میں ہو، مسلمان کے عقیدۂ توحید پر براہ راست ضرب لگاتی ہے اور ہر ایسی مداخلت کے معنی

یہ ہیں کہ مداخلت کرنے والے نے ایک خاص معاملہ میں اپنی خدائی کا عملی اعلان کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان پر مسلمان کا امن وسکون سے بیٹھے رہنا تک اس کے ایمان کو مشتبہ کردیتا ہے کجا یہ حال کہ اس اعلان کے اعلانچی خود مسلمان ہوں اور وہ دوسروں سے بالجبر اسے منوانے کے لیے اپنی قوتیں باطل کے ہاتھ فروخت کردیں۔

پس اصلی مسئلہ قربانی گاؤ کا نہیں ہے بلکہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا سوال درپیش ہے۔ اس کی حفاظت میں کوتاہی کرکے ہم کس اخروی بہبود کی امیدیں قائم کرسکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۶۵ھ، اکتوبر ۴۶ء)

تزکیۂ نفس کی حقیقت

سوال:۔

یہاں کی مقامی فضا تصوّف کے چرچے سے معمور ہے اس وجہ سے اکثر طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں۔

(ا) تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں رسول اللہؐ کی تعلیم کیا تھی؟ متصوفین کا اس سلسلہ میں صحیح عمل کیا رہا ہے۔ نیز ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے اس شعبہ میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟

(ب) کیا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی آج کل کے صوفیاء کی طرح تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے اور عالم بالا کے مشاہدات ہوتے رہتے تھے؟

جواب:۔

سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کرلیجیے کہ عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک پاک صاف کرنا، دوسرے بڑھانا اور نشوونما دینا۔ اس لفظ کو قرآن مجید میں بھی انہی دو معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیہ کا عمل دو

اجزا سے مرکب ہے، ایک یہ کہ نفس انسانی کو انفرادی طور پر اور سوسائٹی کو اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم و عادات سے پاک صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پسندیدہ صفات کے ذریعہ سے اس کو نشو و نما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں کچھ نہیں تو صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈال لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کون سی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسولؐ دور کرنا چاہتے ہیں اور وہ کون سی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث کے مطالعہ ہی سے آپ کو ان تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی جو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور اس کے رسولؐ نے استعمال کی ہیں۔

اہل تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے عام طور پر ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن و سنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ صحابۂ کرام نے تو عالم بالا کے معاملہ میں صرف رسولؐ کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے اپنی ساری قوتیں اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں اور دنیا میں عملاً وہ نظام حق قائم کر دیں جو برائیوں کو دبانے اور بھلائیوں کو نشو و نما دینے والا ہو۔ (ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

الکوہل آمیز ادویہ کا استعمال

سوال: اس زمانہ میں انگریزی دوائیں جو عام طور پر رائج ہیں ان میں سے

ہر رقیق دوا میں الکوہل (جوہر شراب) شامل ہوتا ہے۔ میں ان سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تحریم خمر کے متعلق جو حکم قرآن میں ہے اس میں اگر خمر کا مطلب "نشہ آور چیز" لیا جائے تو دوا میں الکوہل اتنا کم ہوتا ہے کہ نشہ نہیں کرتا اور نہ کوئی اس مقصد سے پیتا ہے، نہ اس ترکیب سے اس کو اپنے لیے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں باریک بینی کی جائے تو ڈبل روٹی میں بھی آٹے کا خمیر اٹھنے پر کچھ الکوہل بن جاتا ہے اور شربت جو بوتلوں میں آتے ہیں ان میں بھی کچھ الکوہل ضرور بن جاتا ہے۔ بلکہ الکوہل تو باسی انگوروں میں بھی بنتا ہے۔ اگر ان صورتوں میں کوئی وجہ حرمت نمودار نہیں ہوتی تو آخر صرف دوا ہی کے اندر الکوہل کی شمولیت کیوں اتنی زیادہ قابلِ توجہ ہے؟

نیز اگر بہ اعتبار لغت خمر کا مطلب انگوری شراب لیا جائے تو الکوہل انگوری شراب نہیں ہے۔ اس لیے انگریزی دوائیں ناجائز نہ ہونی چاہئیں لیکن علماء نے اس زمانہ میں جب ایسی ادویات سامنے نہیں تھیں۔ ایسے سخت فتوے دے دیے ہیں کہ آج انھیں مختلف مواقع پر چسپاں کرنے میں بڑی مشکل پیش آرہی ہے، یہ بھی خیال رہے کہ آج کل یونانی ادویہ مرکبہ کا خالص حالت میں دستیاب ہونا بہت ہی دشوار ہے۔ خمیرہ مروارید میں بڑے سے بڑا متقی دواساز بھی مروارید کی جگہ صدف ملا دیتا ہے۔ نیز جانیں بچانے کے لیے جب لوگ زیادہ ترقی یافتہ انگریزی طب اور جراحی کے ماہرین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور رہیں تو آخر وہ یونانی ادویہ تجویز کر کے تو دینے سے رہے! ان سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔"

جواب:۔

خمر اگرچہ انگوری شراب کو کہتے ہیں۔ لیکن اس سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے چنانچہ

خمر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "الخمر ما خامر العقل" یعنی ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل کو ڈھانک لے اور شریعت میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ "ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہٗ حرام" یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ یہ کم مقدار کی حرمت نشہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کم مقدار استعمال کر لینے سے نفس کے اندر کی وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے یا کم از کم کمزور پڑ جاتی ہے جو حرام چیز کے لیے نفس میں موجود ہوتی ہے۔

پھر یہ بات علمی طریق پر معلوم ہے کہ تمام شرابوں میں وہ اصل چیز جو نشہ پیدا کرنے والی ہے الکوہل ہی ہے۔ اس لیے کسی صورت میں اس کا استعمال جائز تو نہیں ہو سکتا البتہ ایسے حالات میں جب کہ فن طب کی ترقی مسلمانوں کے ہاں ایک مدت سے بند ہو چکی ہے اور جدید زمانہ میں اس فن کی تمام ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو حرام و حلال کی تمیز سے خالی ہیں اور انھوں نے نئے زمانہ کی بیشتر مؤثر دواؤں میں الکوہل کو ایک اچھا محلّل پا کر دوا سازی میں بکثرت استعمال کیا ہے۔ افراد کے لیے اضطرار کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کسی انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی صحت اور اپنی زندگی کی حفاظت کے صرف ان ذرائع پر انحصار کرے جو کسی خاص زمانہ تک دریافت ہوئے ہوں اور اس زمانہ کے بعد دریافت ہونے والے ذرائع خواہ کتنے ہی کارگر اور مفید ہوں۔ ان سے اجتناب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔ اس لیے افراد تو اضطرار کی بنا پر ان ذرائع میں حرمت کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں لیکن تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس وقت تک اس گناہ کے ذمہ دار بنتے رہیں گے جب تک وہ فن طب اور دوا سازی کی جدید ترقیات کو مسلمان بنا لینے کی اجتماعی کوشش نہ کریں۔

جدید فن طب اور دوا سازی کو مسلمان بنانے سے میری مراد یہ ہے کہ اس فن کی تمام موجودہ اور آئندہ ترقیات کو اسلام کے اصول اخلاق کا پابند بنایا جائے اور دوا سازی کے تمام موجودہ اور آئندہ ترقی پذیر ذرائع کو اسلامی حدود کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔

یہ کام جب تک اجتماعی سعی سے نہ ہوگا افراد تو اضطرار کی وجہ سے معاف ہوتے رہیں گے۔ لیکن جماعت کے نامۂ اعمال میں مسلسل گناہ لکھا جاتا رہے گا۔ اجتماعی گناہوں کی یہی خاصیت ہے کہ ان کی وجہ سے افراد کے لیے انفرادی طور پر اضطرار کی حالت پیدا ہوجاتی ہے کہ اجتماعی طور پر پوری جماعت گنہ گار قرار پاتی ہے۔

(ترجمان القرآن، رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

راجہ کی غائبانہ سلامی

سوال:۔

"اسکول میں ڈرل کے بعد مہاراجہ صاحب کی سلامی بینڈ پر اتاری جاتی ہے۔ یہ غائبانہ سلامی ہے اور اسے وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بندے کو خدا کی معبودیت میں شریک ماننے سے قولاً و عملاً انکار کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے غور کے لیے مہلت دی ہے آپ میری رہنمائی فرمائیں۔"

جواب:۔

آپ سلامی تو بہر حال نہ دیں۔ خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ لیکن اپنی حد تک اس معاملہ کو بخیر و خوبی ٹالنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو بہت ٹھنڈے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کیجئے کہ وہ اس معاملہ کو طول دینے سے خود احتراز کرے۔ اگر آپ سلامی کے موقع پر ٹل جایا کریں اور ہیڈ ماسٹر اس کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کرتا رہے تو بات چھوٹی رہے گی۔ لیکن اگر وہ مجبور کرے گا اور آپ کے انکار پر باز پرس کرے گا تو کیا عجب کہ بات طول کھینچ جائے اور نہ صرف آپ کے مدرسہ میں بلکہ ساری ریاست میں اس کا اثر پھیل جائے۔ یہی پہلو آپ ہیڈ ماسٹر کو سمجھا دیجئے گا۔ اگر عقل مند ہوگا تو وہ خود خاموشی اختیار کرے گا ورنہ اس کو آخری مرحلہ تک پہونچ جانے

دیجیے اور سمجھئے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اس ریاست میں اس پیغام کو پھیلانے کا ایک موقع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت پیش آجانے کے بعد اپنے آپ کو اچھی طرح تول لیجئے کہ پھر ذرّہ برابر کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے۔ خواہ ملازمت سے برطرفی کی نوبت آئے یا ریاست سے اخراج کی میں بھی آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔ (ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۲ھ، جولائی، اگست ۴۳ء)

غیر حکیمانہ تبلیغ

سوال:۔

ایک شخص کو ایک مدرسے میں تبلیغ کے لیے ملازم رکھا گیا۔ اب مدرسے کے منتظمین خود ہی اس کی تبلیغی مساعی کو روکنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بعض آیات بچوں کو یاد کرانے میں وہ مانع ہوتے ہیں۔ ایسی چند آیات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ (المائدۃ:۵۱)

۲۔ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۹۰)

۳۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ .... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ..... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدۃ: ۴۴-۴۵-۴۷)

اب ایسے شخص کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ اسے مدرسے میں رہنا چاہیے یا نہیں؟

جواب:۔

آپ جس طریقے سے سوال کر رہے ہیں۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ صورت واقعہ اس سے مختلف ہے اور آپ اسے ایک معصوم شکل میں پیش کر کے استفسار کر رہے ہیں۔

تبلیغ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ موقع و محل کو دیکھے بغیر آدمی ہر جگہ ایک ہی طرح کی شدت برتے اور ہر مخاطب کے سامنے وہ انتہائی باتیں کہہ ڈالے جن کا تحمل ابتدائی مراحل میں کم ہی کوئی شخص کر سکتا ہے۔ جہاں لوگ توحید و رسالت اور آخرت کے ابتدائی تصوّرات تک سے بے گانہ ہو کر رہ گئے ہوں وہاں یکایک ان کے سامنے ان عقائد کا محض مکمل تصور ہی نہیں بلکہ اسے تسلیم کرنے کے تمام لوازم اور عملی تقاضے تک پیش کر ڈالنا اور پھر اس پر اتنا اصرار کرنا کہ لوگوں میں چڑ پیدا ہو جائے حکمتِ تبلیغ کے خلاف ہے۔

اگر آپ کو، یا آپ کے کسی دوست کو، کسی وکیل یا جج کے ہاں بچوں کو پڑھانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے کیسی غلطی کی ہے کہ اس کے بچوں کو چن چن کر وہی آیتیں یاد کرانی شروع کر دیں جو آپ نے نقل فرمائی ہیں اور اس طرح اسے مجبور کر دیا کہ یا تو وہ قرآن کے مقابلے میں آکھڑا ہو۔ یا نہیں تو خود اپنے بچوں کی نگاہ میں کافر و فاسق قرار پائے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اگر آپ بتدریج ان بچوں کو اسلامی عقائد کے مبادی سے، پھر ان کی تفصیلات سے، پھر ان کے لوازم اور تقاضوں اور مطالبوں سے آگاہ کرتے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے ذریعہ سے یہ چیزیں ان کو سمجھاتے چلے جاتے تو خطرے کا الارم بھی نہ بجتا، بچوں کو دین کی تعلیم بھی اچھی طرح مل جاتی اور ان کے والد صاحب چاہے جو کچھ بھی بنے رہتے، مگر ان کی اولاد درست ہو جاتی۔ آپ نے اس کے برعکس کم سمجھ بچوں کو ایسی باتیں یاد کرانی شروع کر دیں، جن کی بنا پر وہ ہر جگہ الٹے سیدھے فتوے جڑنے لگے ہوں گے، یہی چیز خطرے کی گھنٹی بن گئی۔ اور اس نے وہ صورتِ حال پیدا کر دی جس میں آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ بچے کسی ایسے ہی معلّم کے حوالے کیے جائیں گے جو مذہب کا ایسا تصور ان کے ذہن میں بٹھائے جس کی رو سے خدا اور قیصر کے حقوق الگ الگ ہوں اور ساتھ ساتھ بے کھٹکے ادا کیے جا سکیں۔

(ترجمان القرآن، محرم، سفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

خلافیات

تقلید و عدم تقلید

سوال:۔

تقلید ائمہ اربعہ کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟ یعنی تقلید کو آپ کسی حد تک جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر جائز سمجھتے ہیں تو کس حد تک؟ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں۔ آپ ایک وسیع المشرب مقلد ہیں۔

جواب:۔

میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحب علم آدمی کو براہِ راست کتاب و سنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس تحقیق و تجسس میں علماء سلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہیے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصّب سے پاک ہوکر کھلے دل سے تحقیق کرنا چاہیے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب و سنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جو چیز حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔
میں نہ مسلک اہل حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ جماعتِ اسلامی میں جو شریک ہوں ان کا فقہی مسلک لازمًا میرے فقہی مسلک کے مطابق یا اس کے تابع ہو۔ وہ اگر فرقہ بندی کے تعصّبات سے پاک رہیں اور حق کو اپنے ہی گروہ میں محدود نہ سمجھیں تو وہ اس جماعت میں رہتے ہوئے اپنے اطمینان کی حد تک حنفی، شافعی، اہل حدیث یا کسی دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

سوال:۔

تقلید ائمہ اربعہ کو گروہ اہل حدیث حرام و شرک بتاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟
کیا مقلدین اہلِ حدیث نہیں ہیں؟ تقلید اصل میں کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے؟

جواب:۔

اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی نہیں

ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

ائمہ کی پیروی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان ائمہ نے اللہ اور رسولؐ کے احکام کی چھان بین کی۔ آیاتِ قرآنی اور سنتِ رسولؐ سے معلوم کیا کہ مسلمان کو عبادات اور معاملات میں کس طریقہ پر چلنا چاہیئے اور اصولِ شریعت سے جزئی احکام کا استنباط کیا۔ لہٰذا وہ بجائے خود آمر و ناہی نہیں ہے۔ نہ بذاتِ خود مطاع اور متبوع ہیں بلکہ علم نہ رکھنے والے کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ہیں۔ جو شخص خود احکامِ الٰہی اور سنن نبوی میں نظر بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اصول سے فروع کا استنباط کرنے کا اہل نہ ہو۔ اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علماء اور ائمہ میں سے جس پر بھی اسے اعتماد ہو۔ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اس حیثیت سے ان کی پیروی کرتا ہے۔ تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی شخص ان کو بطور خود 'امر و ناہی' سمجھے۔ یا ان کی اطاعت اس انداز سے کرے جو اصل 'امر و ناہی' کی اطاعت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ائمہ میں سے کسی کے مقرر کردہ طریقے سے ہٹنے کو اصل دین سے ہٹ جانے کا ہم معنی سمجھے اور اگر کسی ثابت شدہ حدیث یا صریح آیت قرآنی کے خلاف ان کا کوئی مسئلہ پایا جائے تب بھی وہ اپنے امام ہی کی پیروی پر اصرار کرے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا۔

(ترجمان القرآن، رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

وہابی اور وہابیت

سوال:-

فرقۂ وہابیہ کا بانی کون تھا؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے؟ ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں؟ کیا علمائے اسلام نے اس

تردید نہیں کی؟ اگر کی ہے تو کس طریقہ پر؟ آیا اس فرقہ نے اشاعتِ اسلام میں حصّہ لیا ہے یا مخالفتِ اسلام میں؟

جواب:۔

وہابی دراصل کسی فرقہ کا نام نہیں ہے۔ محض طنز اور طعن کے طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے، جو یا تو اہلِ حدیث ہیں، یا محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ہیں۔ اہل حدیث کا مسلک تو قدیم ہے۔ ائمہ اربعہ کے زمانہ سے چلا آتا ہے اور یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد بن عبدالوہاب کے پیرو، تو وہ دراصل حنبلی طریقہ کے لوگ ہیں۔ ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد بن حنبلؒ کے تھے۔ ہندوستان میں یہ موخرالذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہاں وہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اوّل اوّل نہایت اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں اچھے افراد پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جو خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں اور ایسے ہی جاہل خود حنفی کہلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری مناظرہ و مباحثہ اور فرقہ بازی کی گرمیٔ بازار انہی دونوں فریقوں کی برکت ہے۔

سوال:۔

کیا کسی حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اٹھے گا؟ کیا یہ حدیث مذکورہ فرقہ پر منطبق ہوتی ہے؟

جواب:۔

نجد یا مشرق کی طرف سے ایک فتنہ اٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے، مگر اس کو محمد بن عبدالوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندھے جوش کا نتیجہ ہے۔ ایک فریق جب دوسرے فریق سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر ہتھیار اس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا اور رسولؐ کو بھی ایک فریقِ جنگ بنانے

میں دریغ نہیں کرتا۔ (ترجمان القرآن، رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

مذہب حنفی اور حدیث

سوال:۔

بعض اعمال میں اقوالِ حضرت امامِ اعظم بظاہر احادیث صحیحہ کے خلاف پائے جاتے ہیں۔ جیسے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، شرط مصر فی صلوٰۃ الجمعہ وغیرہ۔ تو کیا امام موصوف کے اقوال قرآن و حدیث سے مستنبط ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ احادیث کون سی ہیں؟ کیا وہ عند المحدثین صحیح ہیں؟

جواب:۔

ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے مذہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر اہل حدیث کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہیں اور ان ائمہ کے پیروؤں کی طرف سے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔ جو شخص خود علم رکھتا ہو اور جس میں خود اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو وہ فریقین کے درمیان محاکمہ کر سکتا ہے اور اسے حق ہے کہ حدیث سے جس طریقہ کو ثابت پائے اسے اختیار کرے اور جسے ثابت نہ پائے اسے چھوڑ دے۔ لیکن یہ عام اہل حدیث جو ان مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں ان کا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا ہے۔ یہ اپنے ائمہ و علماء پر اعتماد کرتے ہیں اور حنفی اپنے ائمہ و علماء پر۔ ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں۔ نہ یہ احادیث کا اتنا علم اور اصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کر سکیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فاتحہ خلف الامام یا رفع یدین یا آمین بالجہر حدیث سے ثابت ہے اور اس کا خلاف ثابت نہیں ہے۔ دراصل تقلید کی بنیاد پر ہے۔ نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر۔ لہٰذا ان کے جواب میں خاموشی بہتر ہے۔ البتہ جو علم

رکھتے ہیں وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے، اس کی رو سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جب امام بآواز بلند پڑھ رہا ہو تو مقتدی خاموش رہیں اور جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی فاتحہ پڑھیں۔ اس طرح کسی حکم قرآنی اور کسی حدیث کی خلاف ورزی کا خدشہ نہیں رہتا، اور تمام مختلف دلائل کو دیکھ کر یہ ایک متوسط طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جو شخص امام کے پیچھے کسی صورت میں بھی فاتحہ نہیں پڑھتا، یا ہر حال میں پڑھتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ دونوں مسلکوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں اور وہ شخص جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ جو حکم اس کے نزدیک دلیل سے ثابت ہے اسی پر عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر وہ الزام نہیں رکھا جاسکتا جو حکم شرعی کی بالقصد مخالفت کرنے والے پر رکھا جاتا ہے۔

رہا "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" تو ان کے فعل اور ترک دونوں کی تائید میں دلائل مجھ کو تقریباً مساوی الوزن نظر آتے ہیں۔ اس لیے جو ان افعال کو کرتا ہے وہ بھی حدیث کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے اور جو انھیں ترک کرتا ہے اسے بھی مخالفتِ حدیث کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ شریعت علیہ السلام نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے اور اسی طرح صحابۂ کرامؓ نے بھی۔ اب ایک شخص جس طریقہ کی بھی پیروی کرتا ہے وہ صاحبِ شریعت ہی کا متبع ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیریت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے یا اسے اپنے ہی پسندیدہ طریقہ کی طرف تشدد سے کھینچا جائے۔ ہاتھ اٹھانا یا نہ اٹھانا، اور آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک کا التزام اور دوسرے کے ترک کا اہتمام کیا جائے۔

نمازِ جمعہ میں شرطِ مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے خود امام ابوحنیفہؒ ہی کے استدلال و استنباط کو اس معاملہ میں نہیں سمجھا۔ امام صاحب کا مدعا صرف یہ تھا کہ اقامتِ جمعہ ایسی آبادیوں میں ہو

جو اپنے علاقہ کے اندر مرکزی حیثیت رکھتی ہوں اور یہ حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن بعد کے لوگوں نے مصر کا مدلول متعین کرنے میں کھینچ تان کی اور متعدد ایسی شرطیں بڑھادیں جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ترجمان القرآن میں کی جا چکی ہے۔[1]

(ترجمان القرآن، رجب شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

حدیث کی تدوین جدید

سوال:۔

قرآن کے بعد احادیث نبویہ کو دینی حجت ماننے یا نہ ماننے میں ہمارے اہل فکر و نظر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں تفریط تو یہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث کو تاریخی روایات کی حیثیت دی جائے، اور افراط یہ ہے کہ احادیث صحاح ستہ میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہو، اسے کلیتاً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیث سمجھ لیا جائے اور اس پر دین و اعتقاد کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ میں اپنی معلومات کی کمی اور فکر و نظر کی کوتاہی کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نقطۂ اعتدال نہیں پا سکا۔ براہِ کرم آپ ہی رہنمائی فرمائیے اور ان شبہات کو صاف کر دیجئے۔

کیا احادیث کی تحقیق و تنقیح اور راویوں کے حالات کی تفتیش کا کام اگلے محققین پر ختم ہو گیا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اور پھر اس کے کیا معنی کہ صحیح بخاری تک میں ایسی حدیثیں موجود ہیں جو نقلِ صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں محلِ اعتراض ہیں۔ مثلاً حضرت

---

[1] ملاحظہ ہو تفہیمات حصہ دوم، از مصنف

ابراہیمؑ کا تین مرتبہ جھوٹ بولنا، حضرت موسیٰؑ کا ملک الموت کی آنکھ پر گھونسہ مارنا، وغیرہ روایات کو ملاحظہ کیجئے۔

نیز اگر جواب نفی میں ہو تو بتلائیے کیا وجہ ہے کہ اب تک صحیح اور غلط احادیث کو چھانٹ دینے کا فریضہ متاخرین علماء اسلام نے انجام کیوں نہیں دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مشتبہ روایات پر وارد ہونے والے اعتراضات تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جواب:۔

میں اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کرچکا ہوں کہ احادیث کی تنقید و تنقیح و ترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوا ہے وہ اگرچہ نہایت قابلِ قدر ہے، مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علماء نے پھر یہ کام کیوں نہیں کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دیا ہو، ان کے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھانٹ پرکھ کا کام کیوں نہیں کیا۔

(ترجمان القرآن، رجب شوال ۶۳ھ جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

کیا ایک فقہی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا گناہ ہے؟

سوال:۔

ہمارے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہوگئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم وفضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حقدار ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر طحطاوی میں

ایک بڑے صاحب کمال فقیہہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟

المنتقل من مذهب الیٰ مذهب باجتهاد و برهان آثم یستوجب التعزیر

جواب :-

میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے کچھ زیادہ شدید تر چیز ہے مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک اسکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز، اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔ رہا طحطاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو میں اس کو قابلِ تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہشِ نفس کی بنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بنا پر۔

(ترجمان القرآن رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

کس قسم کا اجماع حجّت ہے؟

سوال :-

ایسا اجماع جو کسی حدیث پر مؤسس ہو واقعی شرعی حجّت ہے اور ایسے اجماع کا منکر یقیناً کافر ہے۔ لیکن ایسا اجماع جو علماء نے کسی ایسے مقصد پر کر لیا ہو۔ جو مخبر صادقؐ کے لفظوں سے صراحتاً ثابت نہ ہو یا کسی ایسی حقیقت سے تعلق رکھتا ہو۔ جس کی تصریح شارع علیہ السلام نے نہ کی ہو اور اسے مصلحتاً مجمل ہی رہنے دیا ہو۔ کیا یہ بھی شرعی حجّت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے؟

جواب :-

اجماع کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے یہاں اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا

مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ اجماع سے مراد اُمّت کا متفقہ فیصلہ ہے، لامحالہ دو ہی قسم کے امور سے متعلق ہو سکتا ہے ایک قسم کے امور وہ جو احکام شرعی میں سے ہوں دوسری قسم کے وہ جو دنیوی تدابیر کے قبیل سے ہوں پہلی قسم کے امور میں سے کسی امر میں اگر امت متفق ہو کر کسی حکم منصوص کی تشریح کرے اور وہ تشریح کسی وقتی ضروریات اور مصلحت کو پیش نظر رکھ کر نہ کی گئی ہو بلکہ اصولاً شارع کا منشا یا سنت کا طریقہ بالاتفاق متعین کیا گیا ہو تو ایسا اجماع یقیناً حجت ہے اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے اور اگر کسی مصلحتِ وقتی کو ملحوظ رکھ کر کسی حکم کی تشریح کی گئی ہو۔ ایسے اجماع کی پابندی اس وقت تک امت پر لازم ہو گی جس وقت تک وہ مصلحت باقی ہے حالات بدل جانے کے بعد اس کی پابندی لازم نہیں رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی اجماع کسی حکم شرعی کی تشریح کے متعلق نہ ہو بلکہ کسی تدبیر دنیوی کے متعلق امت نے متفق ہو کر طے کر لیا ہو کہ اس طرح عمل کیا جائے گا۔ تو اگر اصولِ شریعت میں اس طرز عمل کے لیے کوئی گنجائش موجود ہو تو ایسا اجماع واجب العمل ہو سکتا ہے ورنہ نہیں، نیز یہ کہ ایسا اجماع کبھی دائمی اور ابدی وجوب کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا عین ممکن ہے کہ ایک زمانہ کے مسلمان یا ایک ملک یا ایک قوم کے مسلمان کسی تدبیر یا کسی کام پر اتفاق کریں اور دوسرے زمانہ میں اسی قوم یا اسی ملک کے لوگ کسی اور امر پر اتفاق کریں۔ یہ ملکی اور قومی اور زمانی اجماع صرف ایک خاص زمانے اور خاص ملک یا قوم کے مسلمانوں ہی کے لیے واجب العمل ہو سکتے ہیں۔ بعد کے زمانے والوں یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو اگر اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہو تو یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہو گا کہ چونکہ پہلے فلاں خاص امر پر اجماع ہو چکا ہے یا فلاں ملک میں اس پر اتفاق ہو چکا ہے اس لیے اب اس کے بارے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

فرقہ بندی کے معنی

سوال :-

"آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو سختی کے ساتھ فرقہ بندی سے منع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا سوال یہ ہے کہ آخر صوم وصلوٰۃ و حج وغیرہ ارکان کو کسی نہ کسی مسلک کے مطابق ہی ادا کرنا ہوگا۔ تو پھر بتائیے کہ کوئی مسلمان فرقہ بندی سے کیسے بچ سکتا ہے؟ میرا اپنا خیال ہے کہ بموجب آپ کی رائے کے قرآن وحدیث کے موافق جو مسئلہ ملے اس پر عمل کیا جائے بجز اہل حدیث کے کسی فرقہ کے ہاں جملہ جزئیات میں قرآن وحدیث سے مطابقت نہیں پائی جاتی۔ پس میں نے فی الجملہ مسلک اہل حدیث کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔ پھر کیا میں بھی فرقہ بندی کے الزام کا مورد ٹھیروں گا"؟

جواب :-

فقہ میں اپنی تحقیق یا کسی عالم کی تحقیق کی پیروی کرتے ہوئے کوئی ایسا طرز عمل اختیار کرنا جس کے لیے شریعت میں گنجائش موجود ہو۔ فرقہ بندی نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی قباحت واقع ہوسکتی ہے۔ اس طریقہ سے مختلف لوگوں کی تحقیقات اور ان کے طرز عمل میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے وہ مذموم تفرق و اختلاف نہیں ہے جس کی برائی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے ایسے اختلافات خود صحابۂ کرامؓ اور تابعین میں رہ چکے ہیں۔ دراصل فرقہ بندی جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ فروع کے اختلافات کو اہمیت دے کر اصولی اختلاف بنا دیا جائے اور اس میں اتنا غلو کیا جائے کہ اسی پر الگ الگ گروہ بنیں اور ہر گروہ اپنے مسلک کو بہ منزلۂ دین قرار دے کر دوسرے گروہوں کی تکفیر و تضلیل کرنے لگے۔ اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کرلے۔ شادی بیاہ اور معاشرتی تعلقات میں بھی علیحدگی اختیار کرے اور دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کے سارے جھگڑے انہی فروعی مسائل پر ہوں حتیٰ کہ اصل دین کے کام میں بھی دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کا تعاون ناممکن ہوجائے،

اس قسم کی فرقہ بندی اگر پیدا نہ ہو اور فروع کو صرف فروع کی حیثیت ہی میں رہنے دیا جائے تو مسائل فقہیہ میں مختلف مسلکوں کے لوگ اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے بھی ایک ساتھ اسلامی نظامِ جماعت میں منسلک رہ سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ نومبر، دسمبر ۴۴ء)

فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کی علیحدگی

سوال:-

فقہی اختلافات کی بنا پر بعض صورتوں میں حنفی، اہل حدیث اور شافعی حضرات علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مثلاً ایک گروہ اوّل وقت نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا تاخیر کو افضل سمجھتا ہے۔ اب ان سب کا مل کر ایک جماعت میں نماز پڑھنا کسی نہ کسی کو افضل نماز سے محروم ہی کرے گا۔ اگر "افضل نماز" کی کوئی اہمیت ہے تو پھر آپ کیوں اس "ایک ہی جماعت" کے اصول پر اتنا زور دیتے ہیں؟

جواب:-

آپ کے نزدیک اگر کسی وقت پر نماز پڑھنا افضل اور اولیٰ ہو اور دوسرے مسلمانوں کے نزدیک کسی دوسرے وقت میں پڑھنا افضل ہو تو اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہو کر نماز پڑھنا یا اپنے ہم خیالوں کی جماعت الگ قائم کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ افضل وقت کو چھوڑنے کی برائی سے جماعت کو ترک کرنے اور جماعتیں الگ کر لینے کی برائی زیادہ ہے۔

سوال:-

ایک صاحب نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ غیر صالح العقیدہ لوگوں کے پیچھے بھی عام مسلمانوں

کے ساتھ نماز پڑھ لینی چاہیے اور تفرقہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ نے ایک خط میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ جس شخص کے متعلق مشرکانہ عقائد رکھنا بالکل متحقق ہو جائے اس کے پیچھے تو نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے مگر جس شخص کے عقائد کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کی امامت میں نماز پڑھنا چاہیے۔ ان دونوں جوابات میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے یہاں بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ذرا وضاحت کے ساتھ صحیح مسلک کی نشاندہی فرمائیے۔

جواب:۔

آپ کو جو جواب یہاں سے دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی صریح مشرکانہ فعل یا قول یا عقیدہ جس کے لیے تاویل کی قطعاً گنجائش نہ ہو اور جس کے ماننے والے یا کرنے والے کے لیے یہ فیصلہ کیے بغیر چارہ نہ ہو کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے ایسے قول یا فعل کے مرتکب کے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان بحثوں اور مناظروں اور نزاعوں نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہر گروہ دوسرے کو گمراہ ٹھیرانے اور اس سے دور بھاگنے کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا ہے اور بات بات پر فرقے بنتے ہیں۔ مسجدیں الگ ہوتی ہیں اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع ہوتے ہیں، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اٹھے ہوں ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان میں جو اخلاقی اور اعتقادی خرابیاں پائیں ان کو ہمدردی اور محبت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں ورنہ نمازیں الگ کر لینے کا فائدہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ہم بھی ایک فرقہ بن کے رہ جائیں گے اور ہمارے اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ جسے عبور کرنا محال ہو جائے گا۔

رہا یہ اندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چونکہ آپ کے عقیدہ کے مطابق مقبول نہیں ہے اس لیے اگر آپ اس

کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہوگی۔ تو یہ اصلاً غلط ہے۔ اوّل تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ کس کی نماز مقبول ہوگی اور کس کی نہ ہوگی۔ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔ دوسرے یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پوری جماعت کی نماز امام کی نماز کے ماتحت ایک مجموعہ کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتی ہو اور اگر امام کی نماز مقبول نہ ہو تو سارے مقتدیوں کی نماز بھی غیر مقبول ہو جائے۔ جماعت کی پابندی تو مسلمانوں کو ایک امت بنانے کے لیے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہر حال مقبول ہو کر رہتی ہے خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو۔

سوال:۔

میرا تعلق جس فرقہ سے تھا اس کے بعض سنجیدہ علماء یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ فقہی مسلک میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کو آزادی دیتے ہیں اور واقعتاً جزئی معاملات میں مختلف گروہ متحد الخیال ہیں بھی نہیں تو پھر آپ نماز کی جماعت میں سب کی شرکت کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں؟ خود نماز سے متعلق مسائل میں بہت اختلافات ہیں اور ان کی بنا پر لوگ اپنی نمازیں الگ پڑھنا چاہتے ہیں۔

جواب:۔

فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کو الگ الگ کرنے کا کوئی ثبوت سلف میں نہیں ہے، یہ فقہی اختلافات صحابۂ کرام کے درمیان بھی تھے اور تابعین کے درمیان بھی، اور تبع تابعین کے درمیان بھی۔ لیکن یہ سب لوگ ایک ہی جماعت میں نماز پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ائمہ مجتہدین کا بھی رہا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نماز دین کی بنیادوں میں سے ہے اور فقہی اختلافات بہر حال فروعی ہیں۔ ان فروعی اختلافات کی بنا پر نمازیں الگ کرنا تفرق فی الدین

ہے۔ جس کو قرآن نے گمراہی قرار دیا ہے نمازیں الگ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی حیثیت ایک امت کی نہیں رہ سکتی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ جو لوگ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے وہ دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی سعی میں متحد ہو کر کام کر سکیں گے۔ یہ چیز اب نظری نہیں رہی ہے بلکہ صدیوں کے عملی تجربہ نے اسے ثابت کر دیا ہے لہٰذا جو لوگ اپنے فرقی اختلافات کی وجہ سے نمازوں کی علیٰحدگی پر اصرار کرتے ہیں وہ دراصل دین کی جڑ پر ضرب لگاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ، نومبر، دسمبر ۴۴ء)

اختلافی مسائل پر امّت سازی کا فتنہ

سوال:۔

مجھے مذہبی تنازعہ اور تفرقہ سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزئی مسائل جن میں اختلافات کی گنجائش خود شریعت میں موجود ہے۔ ان میں اختلاف کو جائز رکھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں دو یا تین طریقہ ہائے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو جائز اور سنت کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کر لیتا ہوں۔ کبھی اِس پر اور کبھی اُس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا پورا اطمینان ہے اور میں نے سوچ سمجھ کر اسے اختیار کیا ہے۔ مگر میرے والد مکرم جو جماعتِ اسلامی کے رکن بھی ہیں محض نماز میں رفعِ یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے انھوں نے مجھے یہ نوٹس دے دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام و کلام کا تعلق برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب یہ قضیہ

میرے اور والد مکرم کے حلقۂ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید و تردید میں لوگ زورِ استدلال صرف کر رہے ہیں۔

مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات عموماً ہو رہے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تو حنفی ہو گیا ہے، تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دو عملی اور نفاق ہے۔ تم جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گئے ہو۔ تمہارا اصل مقصود جلب زر اور حصول عزت ہے۔ تمہیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے، تو مودودی صاحب کا مقلد ہے، وغیرہ۔

ان اعتراضات میں ایک دلچسپ ترین اعتراض یہ ہے کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعتِ اسلامی کے نام پر اہلِ حدیث کو حنفی بنا کے رہیں گے۔ چنانچہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا یعنی پہلے تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہے گا۔ مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود کوئی احساس تک نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔

میں حسب موقع ان سب اعتراضات کے جوابات دیتا رہا ہوں لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے امور ذیل کی وضاحت چاہتا ہوں۔

۱۔ والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا میں والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہلِ حدیث کی خلاف ورزی (ترک رفع یدین) کرنے پر سخط الرب فی سخط الوالد (سنن ترمذی، کتاب البر والصلہ) کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا۔

۲۔ ازروئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترکِ رفع یدین سے آدمی دائرۂ اسلام سے

خارج ہوجاتا ہے؟

۳۔ کیا جماعتِ اسلامی کا ایک رکن دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کرسکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلک اہلِ حدیث کی خلاف ورزی کی ہے۔

جواب:۔

جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ جماعتِ اسلامی میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصّب اور تشدّد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ جیسا قابلِ اعتماد آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کے بیان کی تائید نہ ہوگئی ہوتی تو شاید میں اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ واقعی ہماری جماعت میں ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہوگی بہرحال اب اس نزاع نے سر اٹھا ہی لیا ہے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ کی اصولی اور فقہی اور جماعتی حیثیت کو صاف صاف واضح کردوں۔

۱۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا گروہ کا کسی خاص طریقِ تحقیق و استنباط یا کسی مخصوص مذہبِ فقہی کی پیروی کرنا اور چیز ہے اور اس کا اپنے خاص طریقہ یا مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر جتھہ بندی کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں سے مغایرت و منافرت برتنا اور اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو اس طرح ملامت کرنا کہ گویا ان کے دین میں کوئی نقص آگیا ہے بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری پوری گنجائش ہے۔ بلکہ خود صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور دین میں اس سے کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز بعینہٖ وہ تفرق فی الدین ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے اور اس تفرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ پھر ان مسائل میں ذرا ذرا سے اختلاف پر ان کے درمیان الگ الگ امتیں بنتی ہیں۔ پھر ان فروعی بحثوں میں وہ اس قدر الجھتے اور

ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امتِ مسلمہ کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین) کی خاطر مل جل کر جدوجہد کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

مسلک فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریق اہلِ حدیث یا طریق حنفی یا طریق شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خود کسی قباحت کا موجب نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کر لے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک امت نہ رہیں بلکہ اہلِ حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ ساتھ الگ الگ مستقل امتیں بن جائیں اور شرعی اعمال کی جو خاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیار کی ہیں وہ ہر ایک گروہ کے مخصوص شعائر قرار پا جائیں۔ جن کی بنا پر ان گروہوں میں مغایرت اور امتیاز واقع ہو تو پھر یقیناً یہ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم اور تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اور ایسے ہی دوسرے امور صرف اسی وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یا فعل کو اس بنا پر اختیار کرے کہ اس تحقیق میں صاحبِ شریعت سے ایسا ہی ثابت ہے یا یہ کہ ایسا کرنا دلائل شرعیہ کی بنا پر راجح اور اولیٰ ہے۔ مگر جب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے شعار بن جائیں اور ان کا ترک یا فعل وہ علامت قرار پائے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقہ میں داخل اور کس سے خارج ہیں اور پھر انہی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہے اور کون غیر، تو اس صورت میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا، یا آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا یا ایسے ہی دوسرے امور کا ترک اور فعل دونوں یکساں بدعت ہیں اور بدترین قسم کی بدعت ہیں۔ اس لیے کہ سنتِ رسول اللہؐ میں بجائے خود تو ان اعمال کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان اعمال کو مسلمانوں کے اندر گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کے لیے علامات اور شعائر بنایا جائے۔ ایسا کرنا دراصل حدیث کا نام لے کر صاحبِ حدیث علیہ السلام کے منشا کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اور اس اصل کام کو غارت کرنا جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں

تشریف لائے تھے۔

۲۔ اب اس مسئلہ کی فقہی حیثیت کو لیجئے۔ رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرز عمل منقول ہیں۔

ا۔ ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے، افتتاح صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھ کر۔

ب۔ مالکؓ بن حُوَیرِث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے۔ افتتاح صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اٹھ کر۔

ج۔ وائلؓ بن حجر کی روایت جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے، رکوع سے اٹھتے ہوئے، سجدہ کے موقع پر۔

د۔ ابو حمیدؓ ساعدی کی روایت، اس میں بھی چار مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے۔ مگر چوتھا موقع سجدہ کی بجائے تیسری رکعت میں قعدہ سے اٹھنے پر بیان کیا گیا ہے۔

ہ۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور براءؓ بن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کرنے کا ذکر ہے یعنی افتتاحِ صلوٰۃ کے موقع پر۔

اب مختلف روایات میں سے (ا) کو امام شافعیؒ، احمدؒ اور ابو ثورؒ نے نیز اہلِ حدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالکؒ سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے (د) کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور (ہ) کو ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ابو حنیفہؒ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ رد و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورۂ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضورؐ نے عمل نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقہ کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے وہ حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپؐ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے پس جب معاملہ کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر

کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں کجا کہ اہل حدیث اس کا ارتکاب کریں۔
پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرز عمل پر زیادہ صحیح معنیٰ میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا ہی میں ایک طریقہ کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصّب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آگئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں اس سے ذرا سی بھی مختلف صورت جہاں انھوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری امت سے نکل کر دوسری امت میں جاملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں یہ صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہل تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس[1] سفر میں کتابیں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں زیادہ وسیع پیمانہ پر شواہد پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے۔ اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔
شاہ صاحب پہلے تو یہ اصولی بات فرماتے ہیں کہ:۔

الاصل ان یعمل	اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث
بکل حدیث الا ان	پر عمل کرے الا یہ کہ کسی مسئلہ میں سب
یمنع العمل بالجمیع	حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے
للتناقض (باب القضاء فی الاحادیث المختلفہ)	غیر ممکن ہو۔

پھر آگے چل کر فصل "فی عدۃ امور مشکلۃ من التقلید واختلاف المذاھب" میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] اس خط کا جواب دہلی میں لکھا گیا تھا۔

ان اكثر صور
الاختلاف بين فقهاء
لاسيما في المسائل التي
ظهر فيها اقوال
الصحابة في الجانبين
كتكبيرات التشريق
وتكبيرات العيدين
ونكاح المحرم وتشهد
ابن عباس و ابن مسعود
و الاخفاء بالبسملة
وبآمين و الاشفاع و
الايتار في الاقامة و نحو
ذلك، انّما هو ترجيح احد
القولين وكان السلف لايختلفون
في اصل المشروعية وانما كان
خلافهم في اولى الامرين ونظيره
اختلاف القراء في وجوه القرأة
وقد عللوا كثيرًا
من هذا الباب بان
الصحابة مختلفون
وانهم جميعًا على
الهدیٰ۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان
اختلاف کی اکثر صورتیں، بالخصوص
ان مسائل میں جن میں صحابہؓ کے اقوال
دونوں طرف پائے جاتے ہیں، مثلاً
تکبیراتِ تشریق، تکبیراتِ عیدین، نکاحِ
محرم، تشہد ابن عباس وابن مسعود،
بسم اللہ اور آمین کا اخفاء، تکبیراتِ اقامت
میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو
مرتبہ پڑھنا وغیرہ۔ ان میں اختلاف دراصل
اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو
کس پر ترجیح ہے۔ ورنہ ان مختلف طریقوں
کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف
کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان
کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے
تھا کہ دو مختلف امور میں اولیٰ کون سا
ہے۔ اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے
قراءت کی مختلف صورتوں میں قاریوں
کے درمیان اختلاف ہے اس معاملہ
میں بیشتر امور کے اختلاف کی وجہ سلف
نے یہ بتائی ہے کہ صحابہؓ کرام خود ان میں
مختلف تھے۔ اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب
کے سب ہدایت پر تھے۔

پھر "باب اذکار الصلوٰۃ وھیئاتھا المندوب الیھا" میں فرماتے ہیں:-

وھو (أی رفع الیدین) من الھیئات وفعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ وترکہ مرۃ والکل سنۃ واخذ بکل احد جماعۃ من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم وھٰذا احد المواضع التی اختلف فیھا الفریقان اھل المدینۃ والکوفۃ ولکل واحد اصل اصیل والحق عندی فی مثل ذالک ان الکل سنۃ۔	اور وہ (یعنی رفع الیدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو نبیؐ نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا۔ اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں۔ صحابہؓ اور تابعینؒ اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک طریقہ کو اختیار کیا ہے اور منجملہ ان معاملات کے ہیں جن میں اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے یکساں سنت ہیں"۔

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلہ کے متعلق الگ بحث کروں، تاہم اس معاملہ میں صاحب الجوہر النقی کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:۔

والصواب ان الخبرین بالجھر بھا والمخافۃ صحیحان وعمل بکل من فعلیہ جماعۃ من العلماء	اور صحیح یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے، دونوں کی روایتیں صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

۴۔ ہماری جماعت کا ان اختلافی معاملات میں جو مسلک ہے اس کی توضیح اس سے پہلے بارہا کی جا چکی ہے اور میں اب ایک مرتبہ پھر اسے صاف صاف الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ اس جماعت میں اہلِ حدیث، احناف، شوافع اور ایسے ہی دوسرے فقہی

طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ بشرطیکہ وہ ان مسلکوں میں سے کسی کے لیے متعصب نہ ہوں۔ اور ان اختلافات کو مغایرت اور جتھہ بندی کا ذریعہ نہ بنائیں جماعت کے اندر جو لوگ بھی شامل ہوں انھیں اسلامی عصبیت کے سوا اور ساری عصبیتیں اپنے اندر سے نکالنی ہوں گی۔ خواہ وہ وطنی عصبیتیں ہوں، نسلی ہوں، طبقاتی ہوں یا گروہی ان کو محبت اور دوستی کے رشتہ میں جوڑنے والی چیز اسلام کے سوا اور کوئی نہ ہو اور ان کے اندر غصہ و نفرت کو بھڑکانے والی بھی اسلام سے دوری کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ کسی رکن جماعت کے لیے کسی دوسرے شخص کا اہل حدیث یا حنفی یا شافعی مسلک پر ہونا، اختیار کر لینا نہ تو سبب محبت ہی ہو اور نہ سبب نفرت، اس لازمی و ضروری شرط کے ساتھ اہل حدیث اہلِ حدیث رہتے ہوئے اور حنفی حنفی رہتے ہوئے اور شافعی شافعی رہتے ہوئے، جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کے لیے متعصب ہو اور اپنے مذہب کے پیروؤں سے محبت اور دوسرے طریقے والوں سے نفرت رکھتا ہو، اور حنفی، شافعی یا اہلِ حدیث ہو جانے کو جرم سمجھتا ہو، اس کے لیے ہماری اس جماعت میں کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ میرے متعلق اس نزاع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر میں صبر کرتا ہوں اور ان لوگوں کے معاملہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں۔ جنھوں نے بغیر کسی علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب و سنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں اخلاقی معاملات میں بھی کتاب و سنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

۵۔ آپ کے والد ماجد نے اس قضیہ میں جو رویّہ اختیار کیا ہے اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اور ایک آپ کے والد ہونے کی حیثیت سے۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس پر میں نمبر ۳ میں روشنی ڈال چکا ہوں لہٰذا وہ براہِ کرم اپنے متعلق فیصلہ کریں کہ آیا وہ اپنے رویّہ کو بدلنا پسند فرماتے ہیں یا

جماعت سے علیحدگی۔ رہی دوسری حیثیت، تو اس کے متعلق میں مختصر طور پر صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے والدین کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلک خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جب کہ اولاد صاحب علم ہو۔ اور تحقیق کی بنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلک فقہی کو اختیار کرنا چاہے تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملہ میں سلف کا صحیح اتباع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہلِ حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آیندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد یہ طریقے محض فقہی مسلک نہ رہیں گے بلکہ نسلی امتیں بن جائیں گے۔ جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔ آپ خود ہی اپنے والد ماجد سے دریافت فرمائیں کہ آیا وہ اپنی آئندہ نسل کو اس فتنے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

(ترجمان القرآن رجب، شعبان ۶۴ھ جولائی، اگست ۴۵ء)

دو شبہات

سوال:۔

میں نے پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ آپ کی دعوت کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اصولاً صرف جماعت اسلامی ہی کا مسلک صحیح ہے۔ آپ کے نظریہ کو قبول کرنا اور دوسروں میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس دور میں ایمان کو سلامتی کے

ساتھ لے چلنے کے لیے صرف وہی راہ اختیار کی جاسکتی ہے جو جماعت اسلامی نے اختیار کی ہے۔ چنانچہ میں ان دنوں اپنے آپ کو جماعت کے حوالے کر دینے پر تل گیا تھا۔ مگر ترجمان القرآن میں ایک دو چیزیں ایسی نظر سے گزریں کہ مزید غور و تأمل کا فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نکتہ چیں اور معترض نہیں ہوں بلکہ حیران و سرگرداں مسافر کی حیثیت سے، جس کو اپنی منزلِ مقصود کی محبت چین نہیں لینے دیتی۔ آپ سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مشارٌ الیہ مسائل کے متعلق میری گزارشات پر غور فرمائیں۔

(۱) مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جاسکتی ہے جسے مدارِ کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے نہ کہ علم الیقین۔

یہ عقیدہ جہاں تک بندہ کا خیال ہے محدثین کے بالکل خلاف ہے۔ کتبِ اصول میں بصراحت موجود ہے کہ جس طرح قرآن مجید مسلمانوں کے لیے قانونی کتاب ہے اسی طرح حدیث، اور جس طرح قرآن مجید کے احکام چاہے اصولی ہوں، چاہے فروعی، ہمارے لیے حجت ہیں، اسی طرح احادیث بھی حجت ہیں۔ آپ کے طرزِ تحریر سے کسی حد تک حدیث سے بے توجہی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ موجود ہیں جن میں آپؐ نے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے، اس سے لازم آتا ہے کہ ڈاڑھی کو مطلقاً بڑھایا جائے۔ آپ کترنے کی گنجائش نکالنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ ابن عمرؓ کی روایت کے بموجب ایک مشت تک کٹوا دیں۔ اس سے زیادہ کم کرنے کی گنجائش نکلتی نظر نہیں آتی۔ باقی جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ صحابہؓ و تابعین کے حالات میں ان کے ڈاڑھیوں

کی مقدار کا ذکر کہیں شاذ و نادر ہی ملتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سلف میں یہ مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا جو آج اسے دیدی گئی ہے تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ اصل میں قرونِ ماضیہ میں لوگ اس کے اس قدر پابند تھے کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج سے چند سال پہلے عام مسلمان ڈاڑھی کو نہ صرف مونڈوانے بلکہ کتروانے تک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے پس اس چیز کی وقعت اور قدر لوگوں کے دلوں سے کم نہ کیجئے بلکہ بحال رہنے دیجئے۔

"ان دونوں شکوک پر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیے۔"

جواب :-

آپ کے شبہات کا جواب بالاختصار دے رہا ہوں۔ غالباً یہ چند سطور اطمینان کے لیے کافی ہوں گی۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو، لیکن قولِ رسولؐ، اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات محدثین کی مسلمہ شرائط تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ تو یقیناً ناقابلِ انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے علمائے اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔

(۲) جو باتیں آپ نے داڑھی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں ان پر میں اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں[1]۔ اور اب خواہ مخواہ ایک ہی بات کو متھے جانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ صاف بات ہے کہ اگر کسی فروعی مسئلے میں میرے دلائل سے آپ کا اطمینان ہو جائے تو بہتر ہے اور اطمینان نہ ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اس معاملہ میں میری رائے کو غلط سمجھ کر رد کر دیں اور جو کچھ خود صحیح سمجھتے ہوں اس پر عمل کریں اس قسم کے جزوی مسائل میں ہم مختلف رائیں رکھتے ہوئے بھی ایک ہی دین کے پیرو رہ سکتے ہیں اور اس دین کی اقامت کے لیے مل کر کام کر سکتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ یہ دو چیزیں میرے سامنے آگئیں اور انھیں دیکھ کر میں رک گیا۔ اس رک جانے کو آپ شاید کوئی تقویٰ کا فعل سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ ذرا غور کریں گے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ فی الواقع آپ نے تقویٰ کا مفہوم غلط سمجھا ہے اور اسی وجہ سے ایک غیر متقیانہ فعل کو متقیانہ فعل سمجھ کر آپ کر گزرے ہیں۔ آپ کو اعتراف ہے کہ یہ جماعت اصل دین کی اقامت کے لیے بنی ہے جو ہر مومن کے عین ایمان کا مقتضا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ "اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے چلنے کے لیے صرف جماعتِ اسلامی ہی کی راہ اختیار کی جا سکتی ہے" اور یہ کہ "اس نظریے کو قبول کرنا اور اسے پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔" اب سوال یہ ہے کہ اس تقاضائے ایمان اور اس فرض کی طرف بڑھتے بڑھتے آپ کا صرف اس لیے رک جانا کہ ایک علمی مسئلہ کی تعبیر اور ایک جزوی فقہی مسئلے کی تحقیق میں جماعت کے اس خادم کی رائے کو غلط پاتے ہیں آخر کس قسم کا تقویٰ ہے؟ فقہی و علمی اختلاف تو خیر بہت چھوٹی چیز ہے کہ اس کے لیے فریقین کے پاس شریعت سے دلائل موجود ہوتے ہیں۔ میں ثابت شدہ سنتوں کے متعلق آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کی خلاف ورزی دیکھ کر بھی اگر آپ فرض سے اجتناب کریں تو کیا یہ پرہیزگاری ہے؟ مثلاً آپ دیکھیں

---

[1] یہ بحث فقہیات کے باب میں بھی گزر چکی ہے اور آگے بھی آرہی ہے۔

کہ امام نے مسجد میں داخل ہوتے وقت بایاں قدم پہلے رکھا اور یہ دیکھتے ہی آپ جماعت چھوڑ کر مسجد سے پلٹ آئیں۔ یا آپ دیکھیں کہ اسلامی فوج کے جنرل نے الٹے ہاتھ سے پانی پیا یا چھینک آنے پر الحمد للہ نہ کہا اور اس خلافِ سنت حرکت سے متنفر ہو کر آپ میدانِ جہاد سے پلٹ آئیں تو کیا واقعی اس کو آپ پرہیزگاری سمجھیں گے۔ آپ کو موازنہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا چھوڑا تھا اور آپ نے کیا چھوڑ دیا۔ وہ بڑا غلط کار تھا کہ اس نے ایک پیسہ ضائع کیا، مگر آپ نے تو اس کے جواب میں خزانہ برباد کر دیا۔ پھر بتائیے کہ زیادہ بڑا غلط کار کون ہوا؟ تاہم یہ آپ کا قصور نہیں ہے بلکہ آج کل دینداری کا عام ڈھنگ یہی ہے کہ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۶۵ھ، فروری ۴۶ء)

حدیث اور فقہ

سوال:-

ذیل میں آپ کے لٹریچر سے چند اقتباسات دربارۂ مسئلہ، تقلید و اجتہاد مرتب کر کے کچھ استفسارات کیے جاتے ہیں ان سے صرف علمی تحقیق مقصود ہے۔ بحث مدعا نہیں ہے۔

(۱) تمام مسلمان چاروں فقہوں کو برحق مانتے ہیں البتہ یہ ظاہر ہے کہ ایک معاملہ میں ایک ہی طریقہ کی پیروی کی جا سکتی ہے اس لیے علماء نے طے کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو ان چاروں میں سے کسی ایک ہی کی پیروی کرنی چاہیے۔

(رسالہ دینیات طبع دوم ص ۱۲۵)

(۲) پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس حدیث کو وہ (یعنی محدثین) صحیح قرار دیتے ہیں وہ در حقیقت صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب

ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا۔ اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے جائز کمال کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انھوں نے کی ہیں۔ اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد دوسرے بلحاظ تفقہ (تفہیمات۔ مضمون مسلک اعتدال)

(۳) اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ رجال کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں محدثین کے اپنے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔

(ترجمان۔ جلد ۱، عدد ۱، ص ۱۱۰)

(۴) رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا۔ اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ ... "اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے۔ حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ معنیً صحیح ہے"۔ ... "مگر جو لوگ شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر فقیہانہ نقطۂ نظر سے بارہا ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح حدیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء و مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔ روایت کو بالکلیہ رد کرنا بھی غلطی ہے اور روایات پر ہی اعتماد کرنا بھی غلطی ہے بلکہ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہی وہ مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا

ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔"

اب ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر میرے حسب ذیل سوالات پر روشنی ڈالیے۔

ا۔ مسلمانوں کا چاروں فقہوں کو ماننا کس نص صریح کے ماتحت ہے؟

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے؟

ج۔ تفقہ مجتہد اور اسناد حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنّیت ہے؟

د۔ محدث و فقیہہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اسے نرے محدّث یا نرے فقیہہ پر فضیلت ہے یا نہیں؟

ر۔ کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد کو چھوڑا ہو۔

س۔ کیا یہ قولِ ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابلِ قبول ہے، صحیح ہے؟

ص۔ درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسناد صحیحہ رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے۔

ط۔ کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا اور رسولؐ کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جبکہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟"

جواب:-

ا۔ چاروں فقہوں کا برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چاروں فقہی مذاہب کتاب و سنّت سے استنباط کرنے میں ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کسی کے پاس کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں۔ لیکن اصولاً استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو

کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباط مسائل میں کام لیا تھا۔

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ اسناد حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے۔ وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے اور تفقہ مجتہد ایک ایسے شخص کی فیصلہ کن رائے (JUDGMENT) ہے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابلِ قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظامِ شریعت میں کہاں تک نصب (FIT) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (UNFIT) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہر حال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلہ پر مقدم ہوتی ہیں۔ اسی طرح محدث کی شہادت اور فقیہہ کی اجتہادی تحقیق دونوں میں کسی کو بھی مطلقاً دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

ج۔ تفقہ مجتہدین میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسناد حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہادات اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کر کے حکم شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکم شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہہ ہو سکتا ہے اور ایسا شخص نرے محدث یا نرے فقیہہ کے مقابلہ میں اصولاً قابلِ ترجیح ہے۔ لیکن میرا جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے۔ کسی شخص خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظ حدیث میں ہے۔

س۔ اس وقت میرے پیش نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے اور ویسے بھی نظیریں پیش

کرنے سے بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

س۔ ائمہ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی اور کتاب وسنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوئی ہیں ان کے ساتھ اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

ص۔ درایت سے مراد وہ فہم دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ حذاقت کا فنِ طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنھیں اس کی قدر وقیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنھیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے ہو جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب وسنت میں حاصل ہوتی ہو کام نہ لیں تو میرے نزدیک گنہ گار ہوں گے۔

میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت اور فقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا معیار بنا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا، جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحب فن کی فنی مہارت کا کوئی نپا تلا معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضم ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے۔ لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعین کرنے میں غلطی کر کے بھی ویسا ہی مجرم ہو گا۔ حالانکہ شریعت انسان کے استعداد اور اس کے ممکنات کی حد تک ہی بار ڈالتی ہے اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

اسلامی نظام جماعت میں آزادئ تحقیق

سوال :-

تفہیمات کا مضمون "مسلک اعتدال" جس میں صحابہ کرامؓ اور محدثین کی باہمی ترجیحات کو نقل کیا گیا ہے اور اجتہاد مجتہد اور روایت محدث کو ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے اس مضمون سے حدیث کی اہمیت کم اور منکرین حدیث کے خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے یہ رائے نہایت درجہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کے سوالات اگر آپ کے نزدیک بنیادی اہمیت نہیں رکھتے تو جماعت اسلامی کی ابتدائی منزل میں محدثین و فقہاء اور روایت و درایت کے مسئلہ پر قلم اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ اس مسئلہ کے چھیڑنے سے غلط فہمیاں پھیل نکلی ہیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ بروقت ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ کیونکہ حدیث کی اہمیت کو کم کرنے والے خیالات جس لٹریچر میں موجود ہوں اسے پھیلانے میں ہم کیسے حصہ لے سکتے ہیں۔ حالانکہ نظم جماعت اسے ضروری قرار دیتا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تحریریں مع تنقید، اخبارات و رسائل میں شائع کر دی جائیں۔

جواب :-

فقہی مسائل میں اجتہاد و استنباط کے اصول اور طریقوں کے متعلق غالباً پہلے بھی کبھی کوئی شخص ایسی بات نہیں کہہ سکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجائش نہ ہو اور جس پر سب لوگ متفق ہو جائیں اور اگر آپ غور کریں تو آپ کو با آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان اختلافات کے لیے کافی گنجائش خود کتاب اللہ اور ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے، اسی وجہ سے سلف صالحین کے درمیان ہر دور میں اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر کیا ان اختلافات کا منشاء

یہی تھا کہ اصل دین کی دعوت اور اقامت کے لیے بھی مسلمان کبھی ایک جماعت نہ بن سکیں۔ اور اگر صدیوں میں کوئی ایسی جماعت کبھی بنے تو فقہی مسائل پر کلام کرنا چھوڑ دیا جائے ؟ یا نہیں تو پھر سارے فقہی اختلافات کو پہلے صاف کیا جائے۔

اگر آپ کا نقطۂ نظر یہی ہے تو مجھے اس پر افسوس ہے اور سوائے اس کے کہ میں اس کو بدقسمتی سمجھوں اور کیا کر سکتا ہوں لیکن اگر آپ کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے تو پھر براہِ کرم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ہماری یہ جماعت اصل دین کی دعوت و اقامت کے لیے کھڑی ہوئی ہے اور اس کام میں تمام ان فقہی مسالک کے آدمیوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے، جن کے اصول اور طریقوں کے لیے قرآن و حدیث میں بنیادیں موجود ہیں۔ لیکن یہ اجتماع اسی طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کو مسائل فقہیہ میں اصولی گنجائشوں کی حد تک تحقیق کی آزادی حاصل رہے۔ اور یہ آزادیٔ تحقیق ان مختلف المسلک لوگوں کے درمیان ایسی نزاع کی موجب نہ بنے جو نفس اجتماع برائے اقامتِ دین میں مانع ہو۔ اسی وجہ سے میں اس بحث کو ٹال رہا ہوں جسے آپ لوگ بار بار چھیڑ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں۔ اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کے لیے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے، وہی ذہنیت بار بار بروئے کار آئے چلی جارہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام دین کی اصل و اساس بس وہی امور ہیں، جو آپ معرض بحث میں لا رہے ہیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان چیزوں پر بحث کرنے کے لیے اتنا وقت حاصل نہیں جتنا آپ حضرات کو حاصل ہے۔ اس لیے مختصر مختصر جوابات اپنے خطوط میں دیتا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا منشا یہی ہے کہ میں اور سب کام چھوڑ کر انہی بحثوں میں الجھ جاؤں تو بسم اللہ، ایک اور مفصل مضمون روایت اور اجتہاد کی توضیح میں لکھ دوں گا مگر یقیناً اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ آپ حضرات کو اطمینان ہو جائے۔ بلکہ ہوگا یہ کہ جماعت کے اندر اور باہر کے تمام اہل حدیث حضرات میرے ساتھ اس بحث میں الجھ جائیں گے اور ہمارے لیے ایک نصب العین پر جمع ہو کر کام کرنا محال ہو جائیگا۔ پھر یہ فساد اس مقام پر بھی ختم نہیں ہوگا بلکہ جب ان بحثوں کا دروازہ کھلے گا تو میرے وہ

مضامین بھی زیر بحث آجائیں گے جن پر کچھ حنفی حضرات آپ لوگوں کی طرح بگڑے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے محاذ پر ایسی ہی ایک اور جنگ شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ ایک مرتبہ پھر مجھے سوچ کر لکھیے کہ کیا یہی آپ کا منشا ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر یہ باتیں بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں تو جماعت کی ابتدائی زندگی میں ان پر قلم اٹھانا مناسب نہ تھا۔ تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب تک میں نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو۔ اور اگر میں یہ فیصلہ کرلوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار ہو تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔ مگر یقین کیجیے کہ اس معاملہ میں جتنا ناکام میں ہوا ہوں اس سے شاید بہت زیادہ ناکام آپ حضرات ثابت ہوں گے۔ اگر آپ اس دعوت کے لیے کام کرنے کھڑے ہوں تو غالباً چند صفحے بھی ایسے نہ لکھ سکیں گے جو اہلِ حدیث حضرات کے سوا کسی دوسرے گروہ کو ناگوار ہوئے بغیر رہ سکتے ہوں۔ پس خوب سمجھ لیجیے کہ اصل چیز ان مباحث سے پرہیز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو کچھ لکھے یا کہے وہ معقولیت کو برقرار رکھتے ہوئے۔ حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ شانِ تحقیق کے ساتھ لکھے، اور دوسرے لوگ جو اس کے سننے والے اور پڑھنے والے ہیں ان کے اندر کچھ قوت تحمل، کچھ وسعت قلب، کچھ رواداری اور کچھ اصول و فروع کی تمیز موجود ہو۔

آپ کا یہ خیال تو بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ جب لٹریچر میں کوئی وجہ اختلاف موجود ہے تو اسے کیسے پھیلایا جا سکتا ہے۔ ذرا مجھے کوئی ایسا لٹریچر بتا دیجیے جس میں تمام چیزیں تمام لوگوں کے منشاء کے مطابق ہی ہوں۔ موجودہ دور میں نہیں، متقدمین کے دور میں ہی بتلا دیجیے۔

اگر اس بحث کا فیصلہ اس طرح ہو سکے کہ آپ یا آپ کے ہم خیال حضرات میں سے کوئی صاحب میری تحریروں پر ایک تنقید لکھ کر شائع کردیں تو میں اس کو دل سے پسند کروں گا اور اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی نہ لکھوں گا۔ تاکہ کسی طرح اس قضیہ کا خاتمہ تو ہو۔ (ترجمان القرآن، رجب شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

احادیث کی تحقیق میں اسناد اور تفقہ کا دخل

سوال:۔

خط وکتابت کے کئی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اطمینان بخش صورت ظاہر نہ ہوئی۔ تاہم اس خط سے محض ایک سوال کے حل پر ساری بحث ختم ہو سکتی ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ حدیث و فقہ کا ہم پلّہ ہونا، اسنادِ حدیث میں خامیوں کا پایا جانا وغیرہ مضامین آپ کی نظر میں بنیادی ہیں یا فروعی؟ اگر اصولی اور بنیادی ہیں جیسا کہ جماعت کے مستقل کتابی لٹریچر میں اس کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے تو پھر کسی مخالفت کا اندیشہ کیے بغیر جماعت اہل حدیث روایت کے باب میں جو غلو رکھتی ہے اس کی اصلاح و تنقید کے لیے پورا زورِ قلم صرف کیجئے جیسا کہ آپ نے لیگ اور کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے کیا ہے۔ باقی رہا جماعت کے اندر اور باہر بحث کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ تو یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی۔ کیونکہ اب سے پہلے بھی اخبار اہلِ حدیث امر تسر میں تصدیق اہلِ حدیث کے عنوان سے اس پر تنقید ہو چکی ہے اور اب بھی ایک مولوی صاحب ...... میں تفہیمات کے اقتباسات (مسلک اعتدال) سنا سنا کر جماعت اسلامی کے ہم خیال اہلِ حدیث افراد میں بددلی پیدا کر رہے ہیں اور پوری طرح فتنے کا سامان پیدا ہو گیا ہے اور جماعتی ترقی میں مزاحمت ہو رہی ہے۔

لیکن اگر یہ مضامین فروعی اور ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے تو پھر تفہیمات جیسی اصولی اور اہم کتاب اور مستقل لٹریچر کی صورت میں ان پر افہام و تفہیم کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے صرف ترجمان کے صفحات کافی تھے۔ افسوس کہ جس چیز کو آپ

فروعی تحریر فرماتے ہیں، وہی جماعت کی توسیع کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ خود آپ ہی دستور جماعت کی دفعہ ۵ جز (د) میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جماعت اسلامی کے رکن کے لیے ان تمام بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا ضروری ہے جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غیر اہم کو اہم بنایا جا رہا ہے اور اس کے لیے تفہیمات کے صفحے کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں؟ کیا اس سے بڑھ کر بنیادی اصلاح کا کام باقی ہی نہ رہا تھا؟

پھر یہاں دو جدا جدا چیزیں ہیں جنھیں مخلوط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فقہی جزئیات کی تعمیل میں کتاب و سنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس بارے میں بنیادی امور کے اشتراک و اتحاد کے لیے رواداری برتی جا سکتی ہے لیکن اصولی طور پر روایاتِ نبوی اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابلِ برداشت ہے بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے۔ خود اکابر حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں۔ نیز امام ابو حنیفہؒ نے بھی اس قسم کے عقیدہ و خیال سے تبری اور بیزاری ظاہر کی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی)

اب اس کشمکش کو رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ "مسلک اعتدال" والا مضمون آئندہ تفہیمات کے ایڈیشن میں شائع نہ کیا جائے اور ترجمان القرآن میں ایک مہذب و مؤدب تنقیدی مضمون کی اشاعت کا موقع مرحمت فرمایا جائے۔ یہ تنقید ہمدردانہ اور جماعتی ترقی کے لیے ہوگی مخالفانہ اور معاندانہ نہ ہوگی۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔ ترجمان القرآن کی قدیمی وسعت ظرفی اور عالی ہمتی سے اس قسم کی امید وابستہ رکھنا بے جا نہ ہوگا۔"

جواب:۔

میں تو سمجھا تھا کہ میرے آخری خط سے آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اب

اس عنایت نامہ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ میں آپ کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ آپ نے اب جو سوال کیا ہے اس کے سلسلہ میں میرا بھی ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ میری کتاب میں جنھیں آپ مستقل لٹریچر فرماتے ہیں فروع و جزئیات کے متعلق صرف یہی ایک "مسلکِ اعتدال" والی بحث آپ کو نظر آئی ہے یا اور بھی کسی مقام پر میں نے جزئیات و فروع سے بحث کی ہے؟ اگر دوسرے مقامات پر بھی ایسی بحثیں ہیں اور یقیناً ہیں تو جزئیات و فروع سے عدم تعارض اور کلیات و اصول تک تقریر و گفتگو کو محدود رکھنے پر اصرار کی ضرورت آپ کو صرف اسی جگہ کیوں محسوس ہوئی؟

پھر آپ کا یہ ارشاد کہ جزئیات و فروع پر سرے سے میری کتابوں میں بحث ہی نہ ہونی چاہیے۔ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ شاید کوئی شخص بھی مجرد کلیات تک اپنی بحثوں کو محدود رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ کبھی کلیات و اصول کی توضیح میں اسے جزئیات سے بحث کرنی ہوگی۔ کبھی لوگوں کے شکوک و شبہات اور استفسارات کے جواب میں اس کی ضرورت پیش آئے گی اور کبھی خود تحقیق مسائل کے سلسلہ میں بہت سے جزئیات کو زیرِ بحث لانا پڑے گا۔ اور جب یہ چیزیں بحث میں آئیں گی تو لامحالہ بہت سے امور ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی گروہ کے مسلک سے مختلف ہوں گے۔ اس لیے سرے سے آپ کا یہ مطالبہ ہی صحیح نہیں ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آپ نے میرے پچھلے خطوط پر غور نہیں کیا۔ میں نے ان میں یہ بات عرض کی تھی کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مختلف المسلک جماعتوں کو اکٹھا کرنے کے لیے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ یا تو مسائل فقہیہ پر تحقیق کی آزادی سب لوگوں سے سلب کر لی جائے یا پہلے ان سارے مسائل کو طے کر کے ایک مسلک کی جماعت بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے صحیح یہ ہے کہ تحقیقِ مسائل میں سب کے لیے آزادی رہے اور صرف تحقیق ہی کے لیے نہیں بلکہ اس کے اظہار و بیان کے لیے بھی آزادی رہے اور کسی کا مسلک کسی پر مسلط نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں دستور کی جس دفعہ کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس کا منشا وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے بلکہ اس کا منشا مناظرے

اور معرکے بند کرنا ہے۔

میری پچھلی تحریروں سے جو عجیب و غریب معنی آپ نے پیدا کیے ہیں ان پر مجھے افسوس بھی ہے اور حیرت بھی۔ تعجب ہے کہ آپ دوسرے شخص کے مسلک کو سمجھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنی بدگمانی سے ایک بات وضع کرکے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں آپ کا یہ فقرہ کہ "اصولی طور پر روایت نبوی اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دیدینا ناقابل برداشت ہے۔ بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہوسکتا ہے" یقیناً میرے مسلک کی ترجمانی نہیں ہے۔ آپ خود ہی انصاف سے غور کیجئے کہ تفہیمات میں حدیث کے متعلق جو مضامین میں نے لکھے ہیں اور اپنی دوسری کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدلال و احتجاج کرتا رہا ہوں کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ میرا ذرہ برابر بھی کوئی میلان منکرین حدیث کے مسلک کی طرف ہے یا ہوسکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن اور مسلمان سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ نے میرے متعلق یہ گمان کرلیا کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر کسی کے تفقہ یا اپنے اجتہاد یا کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں۔ ترجیح تو درکنار، اگر میں دونو کو مساوی بھی سمجھوں بلکہ اس کا خیال بھی کروں تو مومن کیسے رہ جاؤں گا؟۔

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیث رسولؐ پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل واقعہ یہ نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت رسول اللہ کی طرف منسوب ہو۔ اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک سند کسی حدیث کی صحت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیث رسولؐ

ہونے کا ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ متن پر غور کیا جائے۔ قرآن وحدیث کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس کا لحاظ بھی کیا جائے اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ سے متعلق ہے اس معاملہ میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر بھی نظر ڈالی جائے علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے بس ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ حدیث رسولؐ اور اجتہاد مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں۔ بلکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ روایات کے رد وقبول اور ان سے احکام کے استنباط میں ایک محدث کی رائے بلحاظ سند، اور ایک مجتہد کی رائے بلحاظ درایت کا مرتبہ مساوی ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلہ قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گناہ گار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حدیث رسولؐ مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس کا ہم پلہ پاتا یا اس پر قابلِ ترجیح قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس چیز کا تصور بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح یا غلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلو میں اپنے مضمون مسلکِ اعتدال میں بیان کر چکا ہوں۔ جن امور کو میں نے وہاں نظیر میں پیش کیا ہے وہ بیشتر علامہ ابن عبدالبر کی کتاب "جامع بیان العلم" سے ماخوذ ہیں۔ آپ براہِ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فن حدیث میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آراء پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شد و مد سے کرتے ہیں؟ محدثین کو بالکل ناقابلِ اعتنا تو ہم نے کہا نہیں ہے نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند

کے اعتبار سے حدیث کا کیا حال ہے اور اس معاملہ میں جس پایہ کے محدّث نے اس کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو پوری پوری وقعت بھی دیتے ہیں۔ لیکن فنِّ حدیث کی ان کمزوریوں کی بنا پر جن کا میں نے ذکر کیا ہے ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علم روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات پر پورا پورا اعتماد کر کے ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیث رسولؐ تسلیم کریں جسے اس علم کی رو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔ آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے لیکن اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگا دیں جو فی الواقع ہم نے نہیں کیا ہے۔

آپ اگر "مسلک اعتدال" پر علمی تنقید فرمائیں تو میرے لیے باعثِ شکر گزاری ہو گا۔ مجھ پر میری غلطی واضح ہو جائے تو مجھے اس سے رجوع کرنے میں ہرگز تامل نہ ہو گا۔

(ترجمان القرآن۔ ذی قعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ، نومبر، دسمبر ۴۴ء)

جزئیات شرع اور مقتضیات دین

سوال:۔

اجتماع[1] میں شرکت کرنے اور مختلف جماعتوں کی رپورٹیں سننے سے مجھے اور میرے رفقاء کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں بہت معمولی درجہ کا کام کیا ہے۔ اس سفر نے گذشتہ کوتاہیوں پر ندامت اور مستقبل میں عزم کامل و استقلال اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ جماعتی ذمہ داریاں پوری پابندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ ادا ہوتی رہیں۔

---

[1] جماعت اسلامی کا وہ اجتماع عام مراد ہے جو ۱۹۴۵ء میں بمقام دارالاسلام (متصل پٹھان کوٹ) منعقد ہوا تھا۔

اس امید افزا، اور خوش کن منظر کے ساتھ اختتامی تقریر[1] کے بعض فقرے میرے بعض ہمدرد رفقاء کے لیے باعثِ تکدر رہی ثابت ہوئے اور دوسرے مقامات کے مخلص ارکان و ہمدردوں میں بھی بددلی پھیل گئی۔ عرض یہ ہے کہ منکرین خدا کا گروہ جب اپنی بے باکی اور دریدہ دہنی کے باوجود حلم، تحمل اور موعظۂ حسنہ کا مستحق ہے تو کیا یہ دینداروں کا متقشف تنگ نظر طبقہ اس سلوک کے لائق نہیں ہے؟ کیا ان کے اعتراضات وشبہات حکمت و موعظۂ حسنہ اور حلم و بردباری کے ذریعہ دفع نہیں کیے جاسکتے؟ اختتامی تقریر کے آخری فقرے کچھ مغلوبیتِ جذبات کا پتہ دے رہے تھے۔ تقریر کی صحت میں کلام نہیں صرف اندازِ تعبیر اور طرزِ بیان سے اختلاف ہے قرآن کا اصولِ تبلیغ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" (آل عمران: ۱۵۹) سے اخذ کیا جاسکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ساری مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ آپ کی عادت تبلیغ و تفہیم میں حکیمانہ ہے۔ اسی بنا پر اس دفعہ خلافِ عادت لب ولہجہ کو سخت دیکھ کر تعجب ہوا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحت شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہرِ سنن کی تغیر و تبدل پر ابتداءً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل منافقین اور تغیر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ احفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے ادھر مقدار قبضہ تک احفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ

---

[1] یہ تقریر رودادِ جماعت اسلامی حصہ سوم کے آخر میں درج ہے۔ اور "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" کے نام سے الگ بھی شائع ہوچکی ہے۔

مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لیے آپ بھی اسی جواز پر عمل کریں۔ کیوں کہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جماعت اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔

جواب :۔

مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ اہل مذہب کے ساتھ بھی چاہتے ہیں کہ وہی سلوک کیا جائے جو منکرین کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ آپ نے فقط نرمی ہی کو تقاضائے حکمت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے مان لینے والوں سے جب خلاف حق باتوں کا صدور ہو تو ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہ نسبت مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے جو سرے سے حق کو نہ ماننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے نیز یہ کہ اللہ اور رسولؐ نے جہاں بعض مواقع پر انتہائی نرمی برتی ہے اور وہ عین مقتضائے حکمت ہے بعض دوسرے مواقع پر سخت لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے اور تیز و تند الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور وہ بھی مقتضائے حکمت ہی رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آخری تقریر میں کہی ہیں کیا ان میں کوئی لفظ خلاف حق تھا۔ نیز یہ کہ اس تقریر میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ کیا فی الواقع اس مرحلہ پر ان کا کہنا ضروری نہیں تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو آپ اسے ضرور تحریر فرمائیں۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جو باتیں کہی گئی ہیں وہ حق تھیں اور لوگوں کو اصل مقتضیات دین کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس وقت انھیں صاف صاف بیان کرنے کی ضرورت بھی تھی تو پھر لب و لہجہ کی شکایت فضول ہے۔ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں، جذبات کی بنا پر نہیں۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

آپ کے سامنے صرف اپنا قریبی ماحول ہے مگر مجھ پر جس ذمہ داری کا بار ہے

اس کی وجہ سے میں پوری جماعت اور تحریک کے حالات پر نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اس موقع پر میں مقتضیاتِ دین کو صاف اور واضح طریقہ پر بیان نہ کردوں اور ان لوگوں کی غلطی کو بالکل کھول کر نہ رکھ دوں جو فروع کو اب تک اصل دین بنائے بیٹھے ہیں اور دین کے اصل تقاضوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری تحریک کے حق میں نہایت مہلک ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کا ایک اچھا خاصا گروہ ہماری تحریک سے محض سطحی طور پر متاثر ہوکر ہماری طرف کھنچنے لگا ہے۔ لیکن اپنے سابق تعصبات اور اپنی سابق غلطیوں میں سے کسی چیز میں بھی ذرہ برابر ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ الٹا ہم سے طالب ہے کہ ہم بھی ان غلطیوں میں مبتلا ہوکر وہی خرابیاں برپا کریں جو یہ لوگ صلاح کے نام سے کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر اس مرحلہ میں صاف صاف ان کو متنبہ نہ کردیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جماعت کے اندر آکر یا جماعت کے دروازہ پر کھڑے ہوکر ایسی پیچیدگیاں پیدا کردیتے جن سے کام بننے کے بجائے الٹا خراب ہوتا۔

دراصل جو باتیں میری اس تقریر کو سننے کے بعد اس گروہ کے لوگوں نے کی ہیں ان سے تو مجھے یہ یقین حاصل ہوگیا ہے کہ یہ لوگ فی الواقع دین کے کسی کام کے نہیں اور یہ کہ ان کا ہمارے قریب آنا ان کے دور رہنے بلکہ مخالفت کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے لحاظ سے میری تقریر کے اندر کوئی لفظ بھی قابلِ گرفت نہیں بتا سکتے بلکہ اس کے برعکس جو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جس چیز کو میں نے دین کا اصل مدعا بتایا ہے۔ واقعی قرآن و حدیث کی رو سے دین کا اصل مدعا وہی ہے اور جن چیزوں کو میں مقدم و موخر کررہا ہوں وہ واقعی مقدم و موخر ہیں مگر اس کے باوجود جنھیں میری اس تقریر پر اعتراض کرنے اور بددلی اور رنجش کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا وہ آخر کس قدر و عزت کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات و خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ ایسے لوگ دراصل بندۂ حق نہیں۔ بلکہ بندۂ نفس ہیں۔ ان کے اندر خدا کا اتنا خوف نہیں ہے کہ اپنی غلطیوں پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی اصلاح کریں۔ اور حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اسے قبول کریں۔ اس کے بجائے وہ شکایت یہ کرتے ہیں کہ حق بات انھیں صاف صاف

کیوں کہہ دی گئی اور کہنے والا انہی تعصبات میں کیوں مبتلا نہیں ہے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر منکرین میں سے ہوتے تو ہم ان کی رعایت کچھ نہ کچھ کر سکتے۔ مگر یہ لوگ اپنی اس نفس پرستی کے باوجود حق پرستوں کی صف اول میں کھڑے ہیں اور دینداری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس لیے نہ یہ کسی رعایت کے مستحق ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے دور ہو جانے پر کوئی ایسا شخص افسوس کر سکتا ہے جو حق کے لیے کام کرنا چاہتا ہے یہ لوگ جو کچھ اب تک مذہب کے نام پر کرتے رہے ہیں۔ اس سے دین کی کوئی بات بن نہیں آئی ہے بلکہ کچھ بگڑتا ہی رہا ہے۔ اب میں نے چاہا کہ ان کو صاف صاف بتاؤں کہ اگر واقعی دین کی بات بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے اور تمہارے فہم دین میں کیا قصور ہے۔ جس کی وجہ سے تم اب تک کچھ نہیں کر سکے۔ اگر یہ لوگ واقعی دین کے ساتھ کوئی قلبی تعلق رکھنے والے ہوتے تو میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کے اندر توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن اس کے بجائے یہ لوگ الٹا مجھ سے بگڑ گئے اور اب بھی ان کے نزدیک مرجح یہی ہے کہ انہی تعصبات اور جزئیات پرستیوں میں مبتلا رہیں جن میں اب تک مبتلا رہے ہیں ان کی اس کیفیت کو دیکھ لینے کے بعد میں بہت خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فتنہ پسند گروہ قریب آنے کے بجائے دور جا رہا ہے۔

اگر خدانخواستہ میں اس اجتماع کے موقع پر ان باتوں کو صاف صاف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھتا تو البتہ یہ میری ایسی کوتاہی ہوتی جس پر میں بعد میں افسوس کرتا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو یہ توفیق ہی نہیں دینا چاہتا کہ یہ لوگ اس کے دین کی کوئی خدمت کریں۔ جن فتنوں کی یہ لوگ خدمت کرتے رہے ہیں اللہ نے بھی غالباً یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو انہی فتنوں کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاحِ شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے۔

اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوئی ہیں اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لیے آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ درآنحالیکہ جو امور آپؐ نے عادۃً کیے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈالوں اور جس وضع اور قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا جس کے لیے اللہ کے ہاں مجھ سے سخت بازپرس ہوگی اور اس بازپرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اخروی خطرے میں ڈالوں۔

سوال:۔

حالیہ اجتماع دارالاسلام[1] کے بعد میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا۔ اور اب بھی اقامتِ دین کے فریضہ کو فوق الفرائض بلکہ اصل الفرائض اور اسی راہ میں جدوجہد کرنے کو تقویٰ کی روح سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ "مظاہر تقویٰ" کی اہمیت کی نفی میں جو شدت آپ نے اپنی اختتامی تقریر میں برتی تھی وہ ناتربیت یافتہ ارکین جماعت میں "عدم اعتنا بالسنۃ" کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوگی اور میں دیانتاً عرض کرتا ہوں کہ اس کے مظاہر میں نے بعد از اجلاس ملاحظہ کیے، اس شدت کا نتیجہ بیرونی حلقوں میں اولاً تو یہ ہوگا کہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی بعض داعیین تحریک نے "استہزا بالسنۃ" کی ابتدا اسی طرح کی تھی کہ بعض مظاہر تقویٰ کو اہمیت دینے اور ان کا مطالبہ کرنے میں شدت اختیار

---

[1] اشارہ ہے اسی اجتماع کی طرف جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز جس تقریر پر اس خط میں گفتگو کی گئی ہے وہ بھی وہی تقریر ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یعنی "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں"۔

کرنے کی مخالفت جوش و خروش سے کی۔ دوسرے یہ کہ شرارت پسند عناصر کو ہم خود گویا ایک ایسا ہوائی پستول فراہم کردیں گے جو چاہے درحقیقت گولی چلانے کا کام ہرگز نہ کرسکے۔ مگر اس کے فائر کی نمائشی آواز سے حق کی طرف بڑھنے والے کو بدکایا جاسکے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملات میں عوام کے مبتلائے فتنہ ہوسکنے کا لحاظ رکھا ہے چنانچہ بیت اللہ کی عمارت کی اصلاح کا پروگرام حضورؐ نے محض قوم کی جہالت اور جدید العہد بالاسلام ہونے کے باعث ملتوی کردیا تھا اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ کبھی کسی وعظ و خطبہ میں لوگوں کو اس کی طرف توجہ تک نہیں دلائی۔ بجز اس کے کہ درون خانہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپؐ نے اس کا تذکرہ ایک دفعہ کیا۔

علاوہ بریں مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں بھی دوسرے مسائل کی طرح خود داعی و مصلح اوّل صلوٰت اللہ علیہ کے ذاتی اسوہ کا اتباع راہِ ہدایت ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ روایت مدنظر رکھئے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کث اللحیۃ یملأ صدرہٗ" اس اسوۂ رسولؐ کا اتباع کرتے ہوئے اگر آپ افراط و تفریط کی اصلاح کریں تو پھر ادھر تو معترضین کو عیب چینی کے مواقع کم ملیں گے اور ادھر مغربیت زدہ لوگوں کے لیے طغیانِ نفس و ابائے اطاعت کے لیے کمتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی بنا پر میں نے بوقت ملاقات عرض کیا تھا کہ آپ کا ذاتی تعامل باحفاء اللحیہ و دیگر پہلوؤں سے تکمیل ظواہر سنن بالیقین دین کے لیے مفید ہوگا۔ اس کا خیال رہے کہ ادھر مذہبی مخالفین کا گروہ جس کی اصلاح اس انداز سے کرنی ہے کہ مختلف امور دین کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر انھیں ان کی صحیح اہمیت سے آگاہ کرنا ہے لیکن دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں سنّتِ انبیا خصوصاً ڈاڑھی کی سنت کا اتباع کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ ذریعۂ نفرت و تمسخر ہے، اس گروہ کی اصلاح بھی تو آخر ہمارے ہی ذمہ ہے تو پھر کیا یہ فرض پورا کرنے کے لیے وہی اثباتی شدت زیادہ کارآمد نہیں ہے جو مظاہر تقویٰ کے تحفظ میں

قدیم دیندار طبقہ کی تلقینات کی روح تھی؟

مزید یہ کہ ہم اسلام کی اساسی حقیقتوں ہی کو جب پوری وسعت سے نہیں پھیلا چکے ہیں اور ابھی بے شمار بندگانِ خدا کے سینوں میں اترنے کی مہم سر کرنی باقی ہے تو کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم فروعی امور کے کانٹوں سے دامن بچا کر بڑھتے جائیں اور اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے ایک لحظہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ ہم لوگ جن کا دن رات واسطہ متلاشیانِ اعوجاج و متبغیانِ فتنہ و تاویل سے ہے صرف انہی زائد از ضرورت مسائل میں الجھ کر رہ جائیں گے اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ "مظاہر تقویٰ" وغیرہ قسم کے مباحث پر تحریروں اور تقریروں میں درشت اور شدید طریقہ سے بحث نہ کی جائے۔

جواب:۔

آپ نے جو امور تحریر فرمائے ہیں ان میں سے بیشتر کے جواب میں نے زبانی عرض کر دیئے تھے اور اب بھی اپنے ان زبانی جوابات پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تاہم ایک دو امور اس سلسلہ میں ایسے ہیں جن پر مختصراً کچھ اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

آپ نے بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مظاہر تقویٰ کے متعلق میں نے کوئی شدت برتی ہے جو سنت کے استہزاء کی تمہید بن سکتی ہے اور بعض لوگوں کے لیے سنت سے بے اعتنائی کی موجب ہوئی ہے۔ کیا آپ براہِ کرم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جن کو آپ شدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ آپ کو یاد نہ ہوں تو آپ تھوڑا صبر فرمائیں، میں اپنی اس تقریر کو قلم بند کرا کے انشاء اللہ عنقریب شائع کر دوں گا۔ اس وقت آپ اسے پڑھ لیجئے گا اور میرے وہ الفاظ نشان لگا کر میرے پاس بھیج دیجئے گا جن میں شدت پائی جائے۔ اسی طرح جن ارکان جماعت سے آپ کا تبادلۂ خیال ہوا اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ میری اس تقریر کی بدولت ان میں سنت سے عدمِ اعتناء پیدا ہوا ہے۔ اگر آپ کو ان کے نام یاد ہوں یا کم سے کم یہی یاد ہو کہ وہ کس جگہ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے تو مجھے لکھ دیجئے کہ میں پوری طرح تشخیص کر سکوں کہ آیا ان کے متعلق آپ کا اندازہ غلط تھا یا میرے متعلق ان کا اندازہ۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے بعد جن لوگوں کے چہرے پر ڈاڑھی آئی ہے۔ اتباع سنت کی تبلیغ کا دعویٰ رکھنے والے حضرات میں سے کسی کی تبلیغ سے ان کے چہرے کبھی ڈاڑھی سے مزیّن ہو سکتے تھے حالانکہ جماعت میں آنے کے بعد ہم نے کبھی ان سے ڈاڑھی یا دوسرے مظاہر تقویٰ کے متعلق اشارتاً بھی نہیں کہا کہ وہ فلاں چیز پر عمل کریں۔ باوجود اس کے ان لوگوں نے جو کبھی خواب میں بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کے چہرے پر ڈاڑھی ہو۔ خود بخود ڈاڑھیاں رکھ لیں اور اپنے فیشن تبدیل کرنے شروع کر دیئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے اسی اصل چیز پر تعلیم و تلقین پر سارا زور صرف کیا جو پوری دیندارانہ زندگی کی جڑ ہے۔ یعنی خدا اور رسولؐ کی وفاداری و اطاعت اس کے بعد ہمیں کسی چیز کی الگ الگ تلقین کی ضرورت نہ رہی۔ جس جس بات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا گیا کہ خدا اور رسولؐ کا حکم یہ ہے، یا خدا اور رسولؐ کو یہ پسند ہے اسے اختیار کرنے پر وہ اپنے نفس کو مجبور کرتے چلے گئے اور جس جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا گیا کہ یہ خدا اور رسولؐ کو ناپسند ہے اسے وہ خود بخود چھوڑتے چلے گئے۔ اس سلسلہ میں ان کے اندر وہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں جو آپ لوگوں کے نزدیک اتباع سنت رہی ہیں بلکہ وہ تبدیلیاں بھی ہوئیں جن کے مقتضائے دین ہونے کے تصور سے بہت سے دور آخر کے پیشوایانِ دین تک خالی رہے ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ تیری باتوں سے لوگوں میں سنت سے عدم اعتنا اور استہزاء کی کیفیت پیدا ہوگی یا ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ میں نے تو مجبور ہو کر بلکہ تنگ آ کر صاف صاف بات اس وقت کہی ہے جب کہ ایک گروہ نے اپنے طرز عمل سے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک طرف تو وہ ہماری دعوت پر لبیک کہتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ مگر دوسری طرف جزئیات کو اصول و کلیات پر مقدم رکھنے اور تقریر، تحریر اور بحث و جدال کا سارا زور جزئیات ہی پر صرف کرنے کی پرانی بیماری اس کو ابھی تک لگی ہوئی ہے اس سے مجھے خطرہ ہوا کہ اس بیماری کو لیے ہوئے اگر یہ گروہ جماعت میں آ گیا تو یہاں پھر وہی سب کچھ ہونے لگے گا جو باہر مذہبی میدان میں ہوتا رہا

ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ بتا دینا پڑا کہ ایسے لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں اور ہماری دعوت کا مزاج ان کی افتاد مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اگر اپنے دماغ کی اصلاح کر کے اور اپنے فہم دین کو درست کر کے آنا چاہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد! لیکن اگر وہ جماعت میں آ کر یا جماعت میں رہ کر وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اور جس کی بدولت دین کا کچھ کام بنانے کی بجائے بگاڑتے ہی رہے ہیں۔ تو بہتر ہے کہ وہ ہماری اس جماعت کو خراب کرنے کے بجائے اپنے پرانے مشاغل باہر ہی رہ کر جاری رکھیں۔

اس وجہ سے جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ میں نے کہا، خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا اور کہا۔ خدا کے فضل سے میں نے کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور نہ کہا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلافِ حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اس کا کہنا خدمتِ دین کے اس مرحلہ پر ناگزیر تھا اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔ اب جو باتیں آپ نے تحریر فرمائیں ہیں ان میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے مجھے اپنی اس رائے میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے بلکہ اپنے عمل سے بھی ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انھوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے، میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط، بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں

رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبیؐ جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنتِ رسولؐ یا اسوہ رسولؐ ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسولؐ کو وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے، جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

آپ کو اختیار ہے کہ میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن جب تک میں اپنے مطالعۂ کتاب و سنت کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں اس وقت تک آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ میں اپنے عقیدہ وعلم کے خلاف آپ لوگوں کی مزعومہ سنتوں کو اختیار کروں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ پھر جب ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ لوگ مجھے یہ اندیشہ دلاتے ہیں کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہوں گے اور یہ چیز ان کے اس دعوت کی طرف آنے میں مانع ہوگی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ میری دعوت الی اللہ کے جواب میں مجھ کو الٹی دعوت الی الناس دینا چاہتے۔ جن لوگوں کے اندر حق اور غیر حق کی اتنی تمیز بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں جس چیز کی طرف انھیں بلا رہا ہوں وہ دین میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ جن باتوں کی وجہ سے میری دعوت کو قبول کرنے میں تامل یا انکار کر رہے ہیں۔ ان کا دین میں کیا درجہ ہے، ایسے ناحق شناس اور خدا پرستی کے بھیس میں اپنے تخیلات کو پوجنے والے لوگ آخر کس وزن اور قدر کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات اور ان کے خیالات کی کوئی رعایت کی جائے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول، جمادی الثانی ۶۴ھ، مارچ، جون ۴۵ء)

سنّت اور عادت کا اصولی فرق

سوال:۔

آپ نے مظاہر تقویٰ پر اپنے خیالات کی توثیق فرماتے ہوئے سنت و بدعت کے بارے میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ:۔

"سنت و بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو میں غلط، بلکہ دین میں تحریف سمجھتا ہوں جو آپ کے ہاں رائج ہیں۔"

عرض ہے کہ یہ مسئلہ دراصل اصولی ہے۔ اس پر اگر اطمینان بخش فیصلہ ہو جائے تو بہت سے جزوی مسائل، بلکہ اکثر نزاعات اور ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں۔ لہٰذا سنت اور عادت کی ایسی جامع تعریف فرما دیجئے جو مانع بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی بدعت کے متعلق بھی اپنی تحقیق سے ممنون فرمائیں۔

مزید توضیح مقام کے لیے عرض ہے کہ آپ کا یہ ارشاد کہ:۔

"آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنت رسولؐ یا اسوہ رسولؐ ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسولؐ کو بعینہٖ وہ سنت سمجھ رہے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السّلام مبعوث کیے جاتے رہے۔"

میرے حسب حال نہیں ہے۔ اگرچہ میں مطلق احفاء لحیہ کو سنتِ رسولؐ سمجھتا ہوں، مگر اسے غرض بعثت و مقصد رسالت تو آج سے دس سال قبل بھی نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ مقصد بعثت فقط ایک ہی سنت ہے اور وہ ہے اقامتِ دین، یا قیامِ اطاعت الٰہیہ، باقی امور علیٰ حسب المدارج اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سنت کے ہم پلّہ دیگر سنتیں تو کیا، فرائضِ شرعیہ مثلاً

عمارت مسجد حرام اور سقایۃ الحاج وغیرہ امور بھی نہیں ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی سنت ہے۔ جس کے احیاء کو ماۃ شہید کے اجر کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں حضورؐ کے ذاتی اسوۂ اعفاءِ لحیہ وغیرہ کو سنت مابعد الفرائض الشرعیہ تاحال سمجھتا ہوں اور اسی کی توثیق یا تصحیح کے لیے فوق الصدر استفسار پیشِ خدمت ہے۔

جواب

سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے یا بہ حیثیت ایک شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا۔ اختیار کیے، یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔

اصولی طور پر یہ سمجھئے کہ انبیاء علیہم السّلام انسان کو اخلاقِ صالحہ کی تعلیم دینے اور زندگی کے ایسے طریقے سکھانے کے لیے آتے رہے ہیں جو فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ (الروم ۳۰:۱) کے ٹھیک ٹھیک منشاء کے مطابق ہوں۔ ان اخلاق صالحہ اور فطری طریقوں میں ایک چیز تو اصل و روح کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری چیز قالب و مظہر کی حیثیت۔ بعض امور میں روح اور قالب دونوں اسی شکل میں مطلوب ہوتے ہیں جس شکل میں نبی اپنے قول وعمل سے ان کو واضح کرتا ہے اور بعض امور میں روح اخلاق و فطرت کے لیے نبیؐ اپنے مخصوص تمدنی حالات اور اپنی مخصوص افتادِ مزاج کے لحاظ سے ایک خاص عملی قالب اختیار کرتا ہے اور شریعت کا مطالبہ ہم سے صرف یہ ہوتا

ہے کہ ہم اس روح اخلاق و فطرت کو اختیار کر لیں۔ رہا وہ علمی قالب جو پیغمبر نے اختیار کیا تھا تو اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی شرعاً ہم کو آزادی ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے معاملات میں سنت روح اور قالب دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اور دوسری قسم کے معاملات میں سنت صرف وہ روح اخلاق و فطرت ہے جو شریعت میں مطلوب ہے نہ کہ علمی قالب جو صاحبِ شریعت نے اس کے اظہار کے لیے اختیار کیا۔

مثال کے طور پر دین کا منشا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کریں اس کے لیے نبیؐ نے بعض اعمال تو ایسے اختیار کیے جن کی روح اور علمی قالب دونوں سنت ہیں اور دونوں کی پیروی ہم پر لازم ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ اور بعض طریقے آپؐ نے ایسے اختیار کیے جن کی روح تو ہمارے اعمال میں ضرور پائی جانی چاہیے۔ لیکن قالب کی ہو بہو پیروی کرنا لازم نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو آزادی دی گئی ہے کہ ہم اس روح کے ظہور کے لیے جو علمی قالب مناسب سمجھیں اختیار کر لیں۔ مثلاً دعائیں اور وہ عام اذکار جو حضورؐ وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔ ہم پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہم بعینہٖ انہی الفاظ میں دعائیں مانگیں جن الفاظ میں حضورؐ مانگتے تھے۔ البتہ سنت کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان دعاؤں کے طرز اور ان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھیں اور جن الفاظ میں بھی دعائیں مانگیں ان کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی روح موجود ہو۔ اسی طرح اذکار میں سنت صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے مختلف حالات و اعمال میں خدا کو یاد کرتا رہے اس سے استعاذہ کرے، اس سے مدد مانگے اس کا شکر ادا کرے اور اس سے طلب خیر کرے۔ اس سنت کو حضورؐ نے اپنی علمی زندگی میں ان مختلف اذکار کے ذریعہ سے ظاہر اور جاری کیا جو حدیث میں مذکور ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اذکار کو لفظاً بہ لفظ یاد کر کے اسی طرح ان کا التزام کرے جس طرح حدیث میں بیان ہوا ہے تو یہ مستحسن یا مستحب تو ہو سکتا ہے لیکن اسے اتباع سنت کا لازمی تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس سنت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے کسی دوسرے طریقہ سے اس پر عمل درآمد کرے اور اس کے لیے دوسرے الفاظ اختیار کر لے تب بھی وہ بدستور متبع سنت رہے گا۔

اور اس پر خلاف ورزی سنت کا الزام عائد نہ ہوگا۔

یہی فرق تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی ہے۔ مثلاً لباس میں جن اخلاقی و فطری حدود کو قائم کرنا نبیؐ کے مقاصد بعثت میں تھا وہ یہ ہیں کہ لباس ساتر ہوں اس میں اسراف نہ ہو، اس میں تکبر کی شان نہ ہو، اس میں تشبہ بالکفار نہ ہو وغیرہ۔ اس روحِ اخلاق و فطرت کا مظاہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس لباس سے کیا اس میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن کی پیروی جوں کی توں کرنی چاہیے۔ جیسے ستر کے حدود اور اسبال ازار سے اجتناب اور ریشم وغیرہ کے استعمال سے پرہیز، اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرز خاص کا لباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی شخص خاص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنت بنا دیں۔

سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

اب خاص ڈاڑھی کے معاملہ کو لے لیجئے جس پر اس بحث کی ابتدا ہوتی ہے اس معاملہ میں روحِ اخلاق و فطرت جس کو اللہ تعالیٰ ہماری عملی زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ مونچھیں کم کی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے۔ اس کی ہدایت نبیؐ نے ہم کو دی ہے اور یہی سنت ہے۔ اب رہی اس کی عملی صورت تو اس کا کوئی تعین نبیؐ نے اپنے ارشاد سے نہیں فرمایا، حالانکہ کوئی امر اس میں مانع نہیں تھا کہ آپؐ احفاء لحیہ کی مقدار اور قصِ شارب کی حد واضح طور پر مقرر فرما دیتے یا کم از کم یہی فرما دیتے کہ داڑھی اور مونچھ کی ٹھیک ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے۔ جس طرح

نماز کے متعلق حضورؐ نے فرما دیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ پس جب کہ آپؐ نے اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہیں کی اور صرف ایک عام ہدایت دے کر ہم کو چھوڑ دیا تو اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ جو روح اخلاق و فطرت اس معاملہ میں مطلوب ہے، کہ اس کا منشا پورا کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی اور ضروری ہے کہ آدمی ڈاڑھی رکھے اور مونچھ کم کرے۔ اگر کوئی مقدار بھی اس کے ساتھ ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضورؐ کے مشن کا کوئی جز ہوتا تو آپؐ ہرگز اس کے تعین میں کوئی کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملہ میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفاء لحیہ قصّ شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں اختیار کریں۔

اب اگر ایک شخص مونچھوں کے بال مونڈ ڈالتا ہو اور دوسرا شخص انھیں اس حد تک کتر ڈالنا چاہتا ہو کہ کھانے اور پینے میں مونچھوں کے بال آلودہ نہ ہوں تو ان دونوں کو اپنے عمل میں آزادی ہے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کہہ سکتے ہیں میرے نزدیک حکم کا منشا اس طریقے سے پورا ہوتا ہے۔ جو میں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی اس رائے کو تمام دوسرے انسانوں کے لیے شریعت بنانے کی کوشش کرے اور اس کے خلاف جو شخص عمل کر رہا ہو اس کو ملامت کرے۔ اگر وہ اسے شریعت بنانے کی کوشش کرے گا اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کو ملامت کرے گا تو یہ بدعت ہوگی۔ کیونکہ جو چیز سنت نہیں ہے اس کو وہ زبردستی سنت بنا رہا ہے۔ سنت صرف قصّ شارب ہے نہ کہ اس کی کوئی خاص صورت جو کسی شخص نے اپنے استنباط واجتہاد سے یا اپنے رجحان طبع سے اختیار کی ہو۔

اسی طرح ڈاڑھی کے معاملہ میں جو شخص حکم کا یہ منشا سمجھتا ہو کہ اسے بلا نہایت بڑھنے دیا جائے وہ اپنی اس رائے پر عمل کرے اور جو شخص کم سے کم یک مشت کو حکم کا منشا، پورا کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر عمل کرے اور جو شخص مطلقاً ڈاڑھی رکھنے کو (بلا قید مقدار) حکم کا منشا پورا کرنے کے لیے کافی سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر

عمل کرے۔ ان تینوں گروہوں میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ استنباط و اجتہاد سے جو رائے اس نے قائم کی ہے وہی شریعت ہے اور اس کی پیروی سب لوگوں پر لازم ہے۔ ایسا کہنا اس چیز کو سنت قرار دینا ہے جس کے سنت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہی وہ بات ہے جس کو میں بدعت کہتا ہوں۔

رہا یہ استدلال کہ نبیؐ نے ڈاڑی رکھنے کا حکم دیا اور اس کے حکم پر خود ایک خاص طرز کی ڈاڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتادی۔ لہٰذا احادیث میں حضورؐ کی جتنی ڈاڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی ڈاڑھی رکھنا سنت ہے۔ تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے ستر عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لیے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتادیا۔ لہٰذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو میرے نزدیک آج متبعین سنت میں سے کوئی شخص بھی اس سنت کا اتباع نہیں کر رہا ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں۔ جن کو نبیؐ نے ان اصولوں کی پیروی کے لیے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لیے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(ترجمان القرآن صفر ۶۵ھ، جنوری ۴۶ء)

عام مسائل

مفتوح فاتح کی عدالت میں

سوال :۔

آج کل جنگی مجرموں (WAR CRIMINALS) کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بہت چرچا ہے اسلام کا اس ضمن میں کیا حکم ہے ؟

جواب :۔

"جنگی مجرم" کی اصطلاح بھی ایک عجیب اصطلاح ہے جسے یورپ کے مکّارانہ اخلاق نے موجودہ زمانہ میں ایجاد کیا ہے۔ اس کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک قوم جس سے کسی دوسری قوم کی لڑائی محض قومی اغراض کے لیے ہوئی تھی۔ جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے جنگی و سیاسی لیڈروں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ لڑائی دونوں طرف سے اقتدار اور منفعت طلبی کی خاطر ہوئی تھی۔ ایک دنیا پر پہلے مسلط ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے تسلّط کو اور ان فائدوں کو جو اس جابرانہ و ظالمانہ تسلّط کی بدولت اسے حاصل ہو رہے تھے محفوظ رکھے۔ دوسرا بعد میں آیا اور اس نے پہلے تسلط و اقتدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ دیکھ کر اسے ہٹانا چاہا۔ اس لحاظ سے دونوں کی لڑائی کسی پاکیزہ اخلاقی غرض پر مبنی نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ ایک فریق غالب آگیا تو وہ اپنے اس غصّہ اور انتقامی جذبہ کو جو اس کے دل میں محض اس لیے بھڑکا تھا کہ مخالف فریق نے اس کے اقتدار کو چیلنج کیوں کیا۔ اخلاق کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو نہیں مگر ہمارا فریق مخالف ڈاکو اور بدمعاش تھا اور اس نے دنیا کے امن کو غارت کیا (گویا کہ خود انھوں نے دنیا کے امن کو کبھی غارت نہیں کیا تھا) اس نے بستیوں پر ظلم ڈھائے۔ (گویا ظلم و ستم ڈھانے کا ارتکاب ان سے خود کبھی نہ ہوا تھا) اور اس نے عہد و پیمان توڑے (گویا کہ یہ ہمیشہ عہد و پیمان کے بڑے پابند تھے) اس لیے اس

کے بڑے بڑے لیڈر اور فوجی کمانڈر مجرم ہیں اور انھیں اسیر جنگ کی بجائے اخلاقی مجرم کی حیثیت سے سزا دی جانی چاہیے۔ حالانکہ فی الواقع جس قومی جذبہ میں یہ خود سرشار ہیں اور ان کے لیڈر جس جذبہ کے تحت اپنی قومی سربلندی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں اسی جذبہ سے ان کی مخالف قوم کے لیڈر بھی سرشار تھے اور اپنی قوم کے لیے سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور کوشش کے طریقوں میں اخلاقی نقطۂ نظر سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اب اصل غرض تو صرف یہ ہے کہ حریف قوم کے اندر جن لوگوں نے قومی جذبہ کو بھڑکایا تھا اور جو اس امر کی قابلیت رکھتے تھے کہ اپنی قوم کو منظم کر کے اور اس کے وسائل کو ترقی دے کر میدان مقابلہ میں استعمال کر سکیں۔ انھیں ختم کر دیا جائے تاکہ یہ قوم ہمارے اقتدار اور ہمارے تسلط علی الارض کو چیلنج کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ لیکن اس خالص انتقامی جذبہ کی گھناؤنی صورت کو اخلاقی عدل کی خوشنما نقاب سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اخلاقی عدل کا ڈھونگ جس طرح ایک فریق کامیاب ہونے کے بعد رچا سکتا ہے بعینہٖ اسی طرح دوسرا فریق بھی فتحیاب ہونے کے بعد رچا سکتا تھا اور اس صورت میں بھی اخلاقی حیثیت سے یہ ایک نہایت ذلیل قسم کا مکر و فریب ہی ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ موجودہ تہذیب نے دنیا کی بڑی بڑی متمدن اور ذی عزت قوموں اور ان کے مدبرینِ سلطنت کے اندر کس قسم کی بے حیائی پیدا کر دی ہے اور ان قوموں کے علماء و فضلاء اور فلاسفہ اخلاق کی اخلاقی حس کو کیسا کُند کر دیا ہے کہ ایسی ایسی صریح مکّارانہ باتیں علی الاعلان کی جاتی ہیں اور کسی کو ان کے اندر نہ شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ کوئی ان کے گھناؤنے پن کو محسوس کرتا ہے۔ کون صاحبِ عقل و تمیز آدمی، جو عدل کے معنی کا ذرہ برابر شعور رکھتا ہو، یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ جنگ کا ایک فریق عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے فریق کے ساتھ واقعی انصاف کر سکے گا؟ اگر انفرادی زندگی میں کسی مقدمہ کا ایک فریق دوسرے فریق کے لیے جج نہیں بن سکتا تو قومی زندگی میں آخر ایک فریق دوسرے فریق جنگ کے لیے جج کیسے بن سکتا ہے؟

آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام کا اس معاملہ میں کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسلام اس قسم کے مکر کو مکر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے تمام وہ لوگ جو فریقین جنگ میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ آئیں اسیر جنگ ہیں اور اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کے احکام جو کچھ ہیں وہ واضح طور پر میں اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں بیان کر چکا ہوں، لڑائی کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مجرم کی حیثیت سے دشمن کو بلانا اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے خود بیٹھ جانا بہت بڑے پیمانہ کی اخلاقی بے حیائی چاہتا ہے اور اسلام وہ دین ہے جو حیا کو محض شعبۂ اخلاق ہی نہیں، بلکہ شعبۂ ایمان قرار دیتا ہے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول، جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ، مارچ، جون ۱۹۴۶ء)

میدان جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات اور اسلام

سوال:-

آج کل جنگ میں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دور جانا پڑتا ہے اور ان کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے کیونکہ جنگ کے جذبہ کی بیداری کے ساتھ تمام جذبات سفلی بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے۔ اور ان کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے .W.A.C.I دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابلِ نفرین ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تردید کے بعد اسلام اس عقدہ کے حل کا کیا طریقہ بتاتا ہے۔ کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری (PROSTITUTION) نہیں ہے۔

جواب: آپ کے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شاید آپ نے اپنا سوال تحریر

کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔ آپ جس مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اس میں آپ کے پیشِ نظر تو ہیں موجودہ زمانہ کی فوجیں اور ان کی ضروریات۔ لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اسلام سے۔ حالانکہ اسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذمہ لیتا ہے وہ اس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فسّاق و فجّار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجودہ زمانہ کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ انھیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اور جو سلطنتیں ان کو تیار کرتی ہیں ان کے پیشِ نظر کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا اگر وہ اپنی قومی فوج تیار کرتی ہیں تو ان کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارتِ اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو انھیں صرف اس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اس کے لیے ماریں۔ نہ کہ اپنے لیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے اخلاق کی اہمیت سرے سے ان "مہذب" قوموں میں ہے ہی نہیں۔ رہیں زنا، شراب، جوا اور دوسری قسم کی بد اخلاقیاں تو نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک وہ ان کے ہاں پوری قوم کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز جب کہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن طہارت اخلاق کے نقطۂ نظر سے پستی کی اس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل ہی سے کوئی انسان تصوّر کر سکتا ہے۔ انھیں کھانے کے لیے دل کھول کر راشن دیا جاتا ہے۔ پینے کے لیے خُمِ شراب کا مُنہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے۔ خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دے دیے جاتے ہیں۔ پھر سانڈوں کی طرح انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشاتِ نفس جہاں اور جس طرح چاہیں پوری کرتے پھریں

حکومتیں خود بھی ان کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں۔ قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں اور اس پر بھی جب ان انسانی نروں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو ان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلہ میں جہاں بھی مادائیں ان کو نظر آئیں ان سے "بزور" یا "بزر" ان کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی تو وہاں ان کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی۔

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کا حل اسلام کیسے بتا سکتا ہے۔ انھیں مغرب ہی کے مادہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور ان کے شرمناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کر سکتا ہے۔ اسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی و معاشی جغرافیہ کے اوراق پھاڑنے اور جوڑنے کے لیے نہیں تیار کی جاتیں، بلکہ صرف اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت و تبلیغ سے راہِ راست پر نہ آئے تو اسے بزورِ شمشیر اتنا بے زور کر دیا جائے کہ وہ کم از کم فتنہ و فساد سے تو باز آجائے۔ اس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، ان کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں بھی اسی جذبۂ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ صحنِ مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اس میدان میں ان کو اتارنے کے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ اخلاق کے ایک پورے کورس سے انھیں گزارا جاتا ہے۔ انھیں خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر وہ خدا سے پھرا ہوا ہو، کس طرح زیر کریں اور دوسروں کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح خدا کا مطیع بنائیں۔ انھیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں۔ عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دن ان کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گزریں

تو اتیں مصلّے پر ظاہر ہے کہ اس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدہ کے مطابق زمانۂ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبۂ جنگ میں رہے اس کی شہوانی ضروریات موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں ان فوجوں کی طرح آزادی کی خواہشمند ہو سکتی ہے۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانۂ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جیسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا) لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپؐ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔

اس میں شک نہیں کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوئی ہوں ان سے تمتع کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے۔ مگر سخت جاہل ہے وہ شخص جس نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ جس طرح آج کی ناخدا ترس فوجیں غنیم کے ملک میں گھسنے کے بعد عورتوں کو آزادانہ پکڑتی پھرتی ہیں اور جہاں جس سپاہی کو جو عورت مل جاتی ہے وہ اس سے زنا کر ڈالتا ہے۔ ایسی ہی اجازت اسلام نے بھی اپنی فوجوں کو دے دی ہے۔ دراصل یہ اجازت چند شرائط کے ساتھ ہے۔

اول تو عورتوں کو پکڑنا فی نفسہٖ مقصود کی حیثیت نہیں رکھتا کہ خواہ مخواہ فوج کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کی خاطر دشمن قوم کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ لایا جائے بلکہ عہدِ نبوی اور زمانۂ خلافتِ راشدہ کی نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جب کبھی گرفتار ہوں گی دو ہی صورتوں میں ہوں گی ایک اس صورت میں جبکہ وہ دشمن کے لشکر میں ہوں۔ اس صورت میں جس طرح لشکر کے مرد گرفتار ہوں گے اسی طرح عورتیں بھی گرفتار کر لی جائیں گی دوسرے اس صورت میں جب کہ کوئی شہری آبادی اسلامی فوج کا مقابلہ کرے اور عنوۃً (BY STORM) فتح ہو اس صورت میں اسلامی فوج کے کمانڈر کو حق ہے کہ ضرورت سمجھے تو پوری آبادی کو گرفتار کر لے۔ نیز اس صورت میں جو عورتیں اور بچے ایسے رہ جائیں جن کے سرپرست مرد مارے جا چکے ہیں ان کو بھی اسلامی فوج اپنے چارج میں لے لے گی۔

پھر جو عورتیں ان صورتوں میں سے کسی صورت میں فوج کے قبضے میں آجائیں انھیں کوئی سپاہی اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتا جب تک کہ اسلامی حکومت اس امر کا فیصلہ نہ کرلے کہ انھیں لونڈیاں بنا لینا ہے، اور جب تک کہ ان کو فوج میں باقاعدہ تقسیم نہ کر دیا جائے اور یہ فیصلہ صرف اسی صورت میں کیا جائے گا جبکہ غنیم سے فدیے پر یا اسیرانِ جنگ کے تبادلہ پر کوئی معاملہ طے نہ ہوا ہو۔

اس طرح جو عورت حکومت کی جانب سے کسی مرد کی ملک میں باقاعدہ دیدی گئی ہو اس پر صرف وہی ایک مرد تصرّف کر سکے گا اور اس کے لیے بھی قانون یہ ہے کہ استبراء رحم کی خاطر وہ اس وقت تک صبر کرے جب تک اس عورت کو ایک مرتبہ حیض نہ آجائے۔ یہ اس غرض کے لیے ہے تاکہ اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اور اگر حاملہ ہو تو پھر وضع حمل تک اس کو صبر کرنا چاہیے اس دوران میں وہ اس سے مباشرت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

پھر جو عورت اس طریقہ سے کسی شخص کی ملک میں دی گئی ہو وہ اگر اس سے تمتع کرے تو جو اولاد اس کے بطن سے پیدا ہوگی وہ اس شخص کی جائز اولاد قرار پائے گی۔ اور اس کی وارث ہوگی۔ نیز اولاد کی ماں بن جانے کے بعد پھر وہ شخص اس عورت کو بیچنے کا مجاز نہ رہے گا اور اس کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی۔

یہ ہے جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں کے بارے میں اسلام کا اصل قانون۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام حالتِ جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں کسی قسم کی ڈھیل پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام تو ان پر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ جائز تعلق کے مواقع میسر آنے تک بہر حال وہ ضبط نفس سے کام لیں۔ خواہ ایسا موقع میسر آنے میں کتنی ہی مدّت لگ جائے۔

دوسری طرف احادیث و آثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ دیکھنا بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ اس کے سپاہی زیادہ مدّت تک اپنی عورتوں سے علیحدہ رہ کر، اور ان کی عورتیں زیادہ دیر تک اپنے

مردوں سے جدا رہ کر کہیں بداخلاقیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حرمت نساء المجاھدین علی القاعدین کحرمة امھاتکم۔	مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مردوں کے لیے ویسی ہی حرام کی گئی ہیں جیسی خود ان کی مائیں ان پر حرام ہیں۔

اور یہ کہ:۔

مامن رجل من القاعدین یخلف رجلا من المجاھدین فی اھلہ فیخونہ فیھم الا وقف لہ یوم القیمة فیاخذ من عملہ مایشاء، فما ظنکم۔	پیچھے رہ جانے والے مردوں میں سے جو شخص مجاہدین میں سے کسی کے بال بچوں میں اس کا جانشین ہو اور پھر وہ ان کے معاملہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی خیانت کرے وہ قیامت کے روز کھڑا کیا جائیگا اور اس مجاہد کو حق دیا جائے گا کہ اس شخص کے عمل میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تمہارا کیا گمان ہے کہ وہ اس کے پاس کچھ چھوڑ دے گا؟

اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدینے کے دو خوبصورت نوجوانوں کو صرف اس لیے شہر سے منتقل کر دیا تھا کہ آپ نے عورتوں کی زبان سے ان کے حسن کی تعریف سن لی تھی اور آپ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں یہ چیز ان عورتوں کے حق میں فتنہ نہ بن جائے جن کے شوہر جہاد پر گئے ہوئے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کسی عورت سے تشبیب[1] کرے گا اس کو دُرّے لگائے جائیں گے اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جب ایک مرتبہ ایک مجاہد کی بیوی کو اپنے شوہر کے فراق

---

[1] یعنی اپنے اشعار میں اس سے اظہار عشق کرے گا۔

میں مشتاقانہ اشعار گاتے ہوئے سنا تو اگرچہ پہلا حکم آپ نے جاری کیا وہ یہ تھا کہ آئندہ سے سپاہیوں کو اتنی طویل مدت تک ان کی بیویوں سے جدا نہ رکھا جائے جس سے ان کے کسی بداخلاقی میں ملوث ہو جانے کا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر فوج میں رخصت (FURLOUGH) کا طریقہ اسلامی حکومت میں جاری ہی اس غرض کے لیے کیا گیا تھا کہ حکومت اپنے سپاہیوں اور ان کی عورتوں کے اخلاق کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا کنیزوں کے استعمال کی اجازت ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری نہ تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو آپ قحبہ گری کے معنی نہیں جانتے یا کنیزوں سے تمتع کا اسلامی قانون آپ کو معلوم نہیں ہے۔ قحبہ گری اس کو کہتے ہیں کہ ایک مرد کسی عورت سے اس کا جسم کرایہ پر مستعار حاصل کرے اور آج کل کی "مہذب" سوسائٹی میں ایک نئی قسم قحبہ گری کی وہ بھی پیدا ہوگئی ہے جسے "شوقیہ قحبہ گری" (PEMATUERISH PROSTITUTION) کہتے ہیں جس میں یہی عارضی تعلق باقاعدہ طے شدہ کرائے کے معاوضے میں نہیں بلکہ ہدیوں اور تحفوں کے بدلے میں قائم ہوتا ہے اور سوسائٹی میں خاتون خانہ محترمہ کی عزت بدستور برقرار رہتی ہے۔ رہا کنیزوں سے تمتع کا اسلامی قانون تو وہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں دونوں کا مقابلہ کر کے آپ خود دیکھ لیں۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول، جمادی الثانی ۶۴ھ، مارچ، جون ۴۵ء)

ایک ہندو دوست کا خط اور اس کا جواب

سوال :۔

دیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس طویل غیر حاضری کی وجہ صرف یہ خیال تھا کہ آپ کی جملہ تصنیفات کو مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کو آپ کی خدمت میں وضاحت سے پیش کر سکوں گا۔ سو اب آپ کی کلیات کا ایک مرتبہ سرسری مطالعہ کر چکا ہوں۔ فی الحقیقت اپنے مشن کے لیے جہاں

تک اخلاص کا تعلق ہے۔ میں نے آپ کو شری ...... کے بعد واحد پہلا اور آخری رہنما پایا ہے۔ "آخری" کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ شری.... جی جنھیں میں موجودہ دور میں ہندوؤں کی عظیم ترین شخصیت سمجھتا ہوں کی ذات بابرکات کے لیے اپنے دل میں انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے مشن کی تکمیل ہندو قوم پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ ہندو قومیت میں کون سے عناصر شامل ہیں، یا ہندو پن کیا ہے؟ اس کی تسلی بخش تفسیر آج تک نہیں ہوسکی۔ گوشت خور بھی ہندو اور گوشت کا تارک بھی ہندو، وید مقدس کو ماننے والا بھی اور ویدوں کا منکر بھی ہندو۔ گائے کا پجاری بھی ہندو اور گائے کے چمڑے کے جوتے بنانے والا اور گائے کے چمڑے کے ساز وسامان سے گھر کو زینت دینے والا بھی ہندو، بتوں کا پجاری بھی ہندو اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو۔ آستک بھی ہندو اور ناستک بھی ہندو، کروڑوں دیویوں دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو اور توحید کا قائل بھی ہندو۔ جو قطعی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بھائی پرمانند جی نے اسی لیے ہندو کی ایک دو حرفی تعریف کی ہے کہ "جو اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے وہ ہندو ہے" ویر ساورکر نے پولیٹکل طور پر یہ تشریح کی ہے کہ "جو اس دیش کو ماتری بھومی اور پنیہ بھومی سمجھتا ہے وہ ہندو ہے۔" کچھ قوم پرست مسلمان اس ملک کو ماتری بھومی ماننے کے لیے تو تیار ہو جاتے ہیں مگر پنیہ بھومی نہیں! تو اس طرح مسلمانوں کا سوال جوں کا توں رہا اور ہندوستان میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کے حل کرنے پر ملک کے بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے جو حل اس کا تجویز کیا ہے وہ فی الواقع نہ صرف مسلمان، نہ صرف ہندو، نہ صرف ہندوستان بلکہ بنی نوع انسان کے لیے یکسانیت رکھتا ہے۔ چند ایک بنیادی اصول ہیں جن کے ماننے والے

ایک طرف، نہ ماننے والے دوسری طرف۔ ایک دوٹوک (CLEARCUT) واضح پالیسی ہے (اسی لیے میں نے آپ کے لیے "آخری" کا لفظ۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کی کلیات کا ایک نظر سے مطالعہ کر لیا ہے۔ آپ نے جو خطبات تعلیمی درسگاہوں میں پڑھے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کو قتل گاہوں سے (SLAUGHTER HOUSES) مناسبت دے کر حقیقت کا اظہار فرمایا ہے اس تلخ صداقت کو بے نقاب کر کے آپ نے جس اخلاقی جرات اور دلیری کا ثبوت دیا ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ میں آپ کے ان خطبات کا جب ان کانووکیشن، ایڈریسیز سے موازنہ کرتا ہوں جو ملک کے چیدہ چیدہ نامور ہستیوں نے دیئے ہیں جن کے نام کے ساتھ بڑے بڑے سائن بورڈ چسپاں ہیں۔ تو یقین فرمائیے، میری طبیعت متلانے لگتی ہے۔

ایک طرف آپ کا قرآن کریم سے روشنی لے کر انسان کی فلاح کی خاطر اسلام کو روشناس کرانے کے لیے دعوتِ عام دینا اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں، سلامتی کا راستہ، دین حق، اسلام کا سیاسی نظریہ، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر وغیرہ لٹریچر کی اشاعت سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا میرے سامنے ہے اور دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ میری قوم کے لیڈر راستی سے بھٹک کر ادنیٰ مقاصد (MINOR ISSUES) پر اپنی اور ساری قوم کی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک طرف آپ کا خطباتِ جمعہ تحریر کر کے ایک ایک مسجد میں اپنے نصب العین کو عوام تک پہونچانے کی سبیل پیدا کرنا ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے گوسوامی گنیش دت اور پنڈت مدن موہن مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی میں مندر کی تعمیر کے لیے لاکھوں روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ آریہ سماج کے بارے میں تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر آج رشی دیانند کا ظہور ہو تو وہ سب سے پہلے

آریہ سماج کا سدھار کریں۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے بارے میں ایک مرتبہ لاہور کے عام جلسہ میں چوہدری خلیق الزماں سابق صدر یوپی مسلم لیگ نے فرمایا تھا کہ ہندوؤں کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ ٹھیک یہی بات بھائی پرمانند جی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس کے ایسے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور رہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے سیاست کے میدان میں طفل مکتب ہیں۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو شاعر کے یہ الفاظ ایک آہ سرد بن کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں ؎

یاسیت کی گردن میں لپٹا ہوا
راستہ تاریک ویران اور اداس
زندگی بے کیف و رنگ و نور ہے
کارواں منزل سے کوسوں دور ہے

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ آپ کے پروگرام نے ملک کی دیگر تمام تحریکوں پر سایہ (SHADE) ڈال دیا ہے آپ کا سارا لٹریچر دیکھ جانے کے بعد مجھے بجز ایک کے اور کوئی بھی مسئلہ ایسا نظر نہیں آیا جس میں دیانت داری کے ساتھ آپ سے اختلاف کرسکوں۔ مانتا ہوں کہ آپ کا پروگرام ہر پہلو سے مکمل (COMPLETE) اور خود کفایت (SELF SUFFICIENT) ہے صرف دو باتیں جو مجھے کھٹکتی ہیں، جناب کی خدمت میں عریاں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" کے مطالعہ کے بعد میرا یقین تھا کہ سنسکرت زبان پر آپ کا عبور ایک لازمی چیز ہے۔ مگر اس شام سیر کے وقت

دورانِ گفتگو میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپ نے سب کچھ ویدوں کے بارے میں انگریزی کتابوں سے لیا ہے۔ سچ مچ مجھے یہ جملہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص برقی رو کے چھو جانے سے جھٹکا سا محسوس کرتا ہے جیسے آپ نے فرمایا تھا کہ ایچ، جی، ویلز کا اسلام کے بارے میں براہِ راست کیا علم ہے جو انھوں نے اسلام اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ زندگی پر بے معنی نکتہ چینی کر کے رکھ دی۔ بعینہٖ آپ کا سنسکرت زبان سے براہِ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وید بھگوان کے بارے میں آپ کے احساسات مستند نہیں کہے جا سکتے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں آزادانہ ترجمہ کرنے پر بھی اصل منشا پورا نہیں ہوتا چہ جائیکہ اسے پھر تیسری زبان میں پیش کیا جائے۔ رشی دیانند نے تو مہی دھر اور رسائن اچاریہ کے وید بھاشیہ کو ہی لغو ٹھیرایا ہے۔ پھر کہاں آپ "میکس میلر" اور دیگر یورپین اصحاب کے ترجمے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ان نیک اور بلند خواہشات کا جو آپ ہندوؤں کے دل و دماغ سے تعصب دور کر کے انھیں اسلام سے صحیح طور پر روشناس کرانے کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں، احترام کرتے ہوئے مودبانہ یہ گزارش کروں گا کہ آپ آئندہ اپنی ان کتابوں پر نظرِ ثانی فرماتے وقت، جن میں خاص طور پر ہندو لٹریچر کے حوالے (REFERENCES) پائے جاتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کی امداد حاصل کریں جو ہندو ابھیاس اور ہندو لٹریچر پر براہِ راست عبور رکھتا ہو۔ (مجھے ذاتی طور پر ایسے دو اصحاب سے قربت کا فخر حاصل ہے) امید ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک پر میرا منشا واضح ہو گیا ہو گا۔

آپ نے "رسالہ اسلام اور جاہلیت" کے اخیر میں یہ فرمایا ہے کہ:۔

"تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ

ان سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے، نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ ..... انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا" اگر صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں نہایت ادب و انکسار سے گزارش کروں گا کہ آپ نے یہاں طرف داری سے کام لیا ہے، یہاں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں صرف ایک بھگوان کرشن کی شخصیت پیش کروں گا جن کی دو حرفی تقریر نے کہ

" فعل سے وابستگی واجب نہیں تیرے لیے
فرض کی تکمیل کر، خواہش صلہ کی چھوڑ دے"

ویر ارجن جیسے مجاہد پر ایک ہیبت کا عالم طاری کر دیا اور اس کے بازو میں برقی طاقت پیدا کر دی۔ اور اس تاریخی واقعہ کی یادگار میں گیتا جیسی ممتاز کتاب ظہور میں آئی۔ بڑے بڑے مخالف بھی کرشن بھگوان کی زندگی میں کوئی اخلاقی رخنہ نہ پیش کر سکے "بھگوان" کا لفظ میں نے صفتی معنوں میں لیا ہے اوتار کے معنوں میں نہیں۔ آپ نے ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کر کے اسلام سے پہلے کی تاریخ کے معاملہ میں تعصب کا ثبوت دیا ہے، سچ بات تو یہ ہے کہ میری آنکھیں ترستی رہیں کہ آپ کسی جگہ کسی ہندو کیرکٹر کا نمونہ پیش کریں۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ نے ترجمان القرآن میں میرے خطوط اور اپنے جوابات شائع فرما کر اسلامی پریس کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ دہلی کا ایک روزنامہ "حکومتِ الٰہیہ اور پاکستان" کے عنوان سے ان خطوط کا حوالہ دے کر آپ پر خوب برسا ہے۔ عجیب منطق ہے کہ دیدہ و دانستہ عین اسلامی تعلیم کو جھٹلایا جا رہا ہے۔

مرحوم مولانا محمد علی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "جہاں تک مسلمانوں کے ایمان کا تعلق ہے۔ میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں۔" لیکن آپ نے اصلی اسلام پیش کر کے اور مسلمانوں کی

ایمانی قوت کو الم نشرح کر کے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے اسلامی لٹریچر کے طفیل وہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے تھا، اور کیا ہو گئے ہیں مگر میری گزارش یہ ہے کہ جب آپ کی حکومتِ الٰہیہ ہر فردِ بشر کے لیے انسانیت کے ناطہ سے یکساں جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کا منشا بھی یہی ہے کہ بہ لحاظ مذہب و ملّت اسے عوام تک پہنچایا جائے، پھر آپ اپنی مساعی (STRUGGLE) کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رکھتے ہیں۔"

جواب :-

آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہِ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی۔ لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ "الجہاد فی الاسلام" بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔ جب مذاہب کے معاملہ میں میرا رویہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا۔ اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہِ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے، از سرِ نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم جو محض حامی دین (DEFENDER OF THE FAITH) ہی نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے۔ تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ کو بناوٹ کے بغیر جیسے کہ بجائے خود وہ ہیں۔ پیش کیا گیا ہو تو مزید باعثِ شکر گزاری ہو گا۔ "بناوٹ کے بغیر" کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر، جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے۔ مگر قومی عصبیت کی خاطر

اس مذہب کو اور اپنے مذہبی طرزِ عمل کو "معقول" بنانے کے لیے وہ اکثر موجودہ نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقہ سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ ویسا ہی رہنے دیں، اور ویسا ہی اسے پیش کریں۔ پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

(دوسری) چیز جس کی آپ نے شکایت کی ہے اس پر آپ کو بجائے مجھ سے شکایت کرنے کے خود ہندوؤں سے شکایت کرنی چاہیے تھی اور مجھے بھی اس معاملہ میں ان سے شکایت ہے انھوں نے خود اپنے بزرگوں کی سیرتوں کو محفوظ نہ رکھا بلکہ ان کی حقیقی زندگیوں کو افسانوں سے خلط ملط کر دیا اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں کو درست ثابت کرنے کے لیے بدترین اخلاقی کمزوریاں اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جن بڑے بڑے اشخاص کی طرف نگاہیں اس توقع سے اٹھتی ہیں کہ انھیں اخلاقی پاکیزگی اور عظمتِ انسانیت کے نمونہ کی حیثیت سے لیا جا سکے گا۔ ان سب کے واقعاتِ زندگی تاریخی حیثیت سے مشتبہ بھی ہیں اور افسانویت سے آلودہ بھی اور جن مآخذ کی سند سے ان کے روشن پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں انھیں کی سند سے ایسے تاریک ترین پہلو بھی آتے ہیں جنھیں کسی بڑے انسان کی طرف منسوب کرنا تو درکنار کسی گھٹیا انسان کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے نہ کہ کسی قومی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے میں مجبوراً عربی تاریخ کے صرف ایک ہی دور کو کمال انسانیت کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ تاریخی حیثیت سے نہایت معتبر ہے۔ افسانویت کا اضافہ کرنے کی اگر اس میں کوشش بھی کی گئی ہے تو تاریخی تنقید کے ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے اس آلودگی کو پورے منصفانہ طریقے سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے

اور پھر وہاں کسی اخلاقی گندگی کا تو سرے سے نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آجائے۔ اگر عرب نسل کے ایک مختصر گروہ کو یہ فضل نصیب ہو گیا تو اس پر کسی افسوس کی ضرورت نہیں اور نہ افسوس کرنے سے کچھ حاصل ہے بلکہ اگر آپ ہندوستانی یا ہندو کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانیت کے لیے جو چیز قابلِ فخر ہے اس پر آپ کو بھی اسی طرح فخر کرنا چاہیے جس طرح ایک عرب فخر کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے جو تاج کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو پہنایا گیا۔ وہ ہم سب انسانوں کے لیے قابلِ فخر ہی ہے خواہ وہ کسی عرب انسان کے سر پر نظر آئے یا ہندوستانی انسان کے سر پر۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول، جمادی الثانی ۶۴ھ مارچ، جون ۴۵ء)

گائے، تناسخ اور گرنتھ صاحب

سوال:۔

حسب ذیل امور سے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائیے۔

(۱) گائے کی تعظیم و تقدیس جو ہندو بھائیوں میں رائج ہے اس کی وجہ سے سیکڑوں دفعہ ہندو مسلم فسادات واقع ہو چکے ہیں آخر یہ کیا مسحوریت ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول عالم موجود ہیں لیکن کوئی اس مسئلہ کی نوعیت پر غور نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ گاندھی جی جیسے فہمیدہ اور جہاندیدہ لیڈر بھی مذہبیت کی اس کشتی پر سوار ہیں۔ جسے عوام نے ایسے ہی چند مسائل پر جوڑ ملا کر تعمیر کیا ہے۔ آپ اس گائے کی پوجا پر روشنی ڈالیں اور واضح کریں یہ کب سے شروع ہوئی اور کیسے پھیلی۔ تو ممکن ہے کچھ حق پسند ہندو مطمئن ہو جائیں اور اپنی قوم کی اصلاح کریں۔

(۲) تناسخ کا عقیدہ ہندو قوم کے ہاں بنیادی اہمیت رکھتا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوؤں کے سوا کوئی دوسری قوم بھی اس کی قائل ہوئی ہے یا نہیں۔ تاہم یہ عقیدہ بھی سنجیدہ تنقید کا مستحق ہے۔

(۳) سکھ قوم کی مذہبی کتاب "گرنتھ" صرف اخلاقی پند و نصائح کا مجموعہ ہے۔ اور اس کو بلحاظ موضوع و مباحث گلستاں، بوستاں، وغیرہ کتابوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب کے صالح اور صوفی منش بزرگوں کے ارشادات و نصائح اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ کتاب کو مدون کرنے والے کا منشا کچھ اور معلوم ہوتا ہے مگر اس منشا کے بالکل خلاف اب یہ ایک قوم کی الہامی کتاب بن گئی ہے۔ حالانکہ اس میں نہ تو تمدنی مسائل سے بحث ہے نہ معاشرت سے کوئی سروکار نہ معاشیات وسیاسیات میں اس سے کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ مگر میری عقل کام نہیں کرتی کہ تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ تک کیونکر اس پر مطمئن ہیں۔"

جواب:۔

آپ نے جو استفسارات کیے ہیں ان میں سے ہر ایک مفصل بحث چاہتا ہے لیکن میرے لیے اس وقت ان چیزوں پر تفصیلی بحث کرنا مشکل ہے۔ نمبروار تینوں مسئلوں پر مختصراً اظہار خیال کرتا ہوں۔

(۱) ہندو مذہب کے متعلق میری معلومات اتنی زیادہ وسیع نہیں ہیں کہ میں اس کے کسی مسئلہ پر تحقیقی بحث کرسکوں اور بغیر کافی معلومات کے کسی چیز پر بحث و تنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ جو تھوڑی بہت واقفیت مجھے حاصل ہے اس کی بنا پر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ قدیم عہد میں جس کو ویدک کہا جاتا ہے۔ گائے کی تقدیس کا عقیدہ موجود نہ تھا۔ یا اگر تھا تو بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چنانچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ اس دور میں ہندو گائے کی قربانی کیا کرتے تھے۔ علم الاقوام کی رو سے بھی یہ ثابت ہے کہ قدیم آریہ قوم خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے تعلق رکھتی تھی۔ جس میں گاؤ پرستی قطعاً مفقود

تھی۔ بعد میں اس کا سابقہ اس مادری تہذیب سے ہوا جو ہندوستان کی دراوڑی قوموں اور عراق مغربی ایشیا اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس تہذیب کی حامل اقوام زراعت پیشہ تھیں اور ان میں گائے کی تقدیس پائی جاتی تھی۔ بس تحقیق اسی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو مصر سے گاؤ پرستی کی چھوت لگی۔ اسی طرح قدیم آریوں کو بھی یہ چھوت ہندوستان آکر لگی ہے۔ جہاں تک گائے کی پوجا کا تعلق ہے وہ تو ہندوؤں کے ایک خاص طبقے میں ہی پائی جاتی ہے لیکن اس کی تقدیس پوری قوم میں پھیلی ہوئی ہے۔ بلکہ جو لوگ ہندوؤں سے نکل کر اسلام یا عیسائی مذہب میں داخل ہوئے ہیں۔ ان کے بھی ایک اچھے خاصے عنصر میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر محض اس لیے پایا جاتا ہے کہ ان کی تبدیلئ ذہن پوری طرح نہیں ہوئی ہے۔

خاص طور پر اس عقیدہ کی تردید کے لیے کچھ کہنا غالباً مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ ایک غلط عقیدہ بہت سے دوسرے غلط عقائد کے ساتھ ہم رشتہ ہوتا ہے۔ اور ایک ان سب کی اصل جڑ ہوا کرتی ہے۔ جب تک اصل اور شاخوں کے پورے سلسلے کی اصلاح نہ کی جائے محض کسی ایک شاخ کو درست کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے تمام غلط عقائد کی جڑ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے نظام اور اس میں اپنے صحیح مقام اور مالک کائنات کے ساتھ اپنے اور دوسری موجودات کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی غلط فہمی سے نتیجہ کے طور پر بے شمار غلط فہمیوں کا ایک سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے جو سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ایک پورا نظام فکر اور نظامِ زندگی پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس بات کو سمجھ لے کہ اس ساری کائنات کا ایک ہی خالق اور ایک ہی مالک و متصرف اور ایک ہی حاکم و مدبّر ہے اور انسان دنیا میں اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے اور دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لیے خادم بنائی گئی ہیں تو ایسا شخص شرک اور مخلوق پرستی اور مادی یا روحانی یا خیالی چیزوں کی تقدیس کے ہر شائبہ سے خود بخود پاک ہو جائے گا اور اس کے دل میں ایک خدا کے سوا کسی کی عبودیت اور کسی کی تقدیس کے لیے جگہ باقی نہ

رہے گی۔ پھر اگر کسی شخص میں صحیح قسم کا معقول پسندانہ رویہ (TRUE RATIONALISM) موجود ہو تو وہ موروثی تعصبات اور شخصی و نفسانی تعصبات سے خود بخود خالی ہو جائے گا اور اپنی فکر اور اپنے عمل کو پوری بے لوثی کے ساتھ اس طریقہ پر قائم کرے گا جو سراسر معقول ہو۔

آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول آدمی موجود ہیں جو وسیع علم اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان عقائد اور خیالات میں مبتلا ہیں جو سرسری نظر میں بھی جاہلیت کے عقائد اور خیالات محسوس ہوتے ہیں۔ اس قسم کا تعجب آپ نے آخری سوال کے سلسلے میں بھی ظاہر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صورتِ حال محض کسی ایک قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا میں بہت سے غلط فکری اور اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پیروؤں میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اور نہایت ذکی و فہیم اور اپنے مسلک کی مخصوص گمراہیوں کے سوا دنیا کے تمام دوسرے معاملات میں غایت درجہ معقول ہوں گے اس کے باوجود ان لوگوں کا ایسی ایسی گمراہیوں میں مبتلا ہونا جن میں سے بعض تو ان کے مخصوص مسلک کو ماننے والوں کے سوا دوسرے تمام لوگوں کو صریحاً غیر معقول محسوس ہوتی ہیں۔ بظاہر ایک حیران کن معاملہ نظر آتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی۔ اس صورت حال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انسانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے۔ جو اپنی عقل اور علم کے استعمال کو زیادہ تر اپنے دنیوی کاروبار اور اپنی جسمانی زندگی کے معاملات و مسائل تک محدود رکھتے ہیں اور اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتے کہ جن فکری و اخلاقی بنیادوں پر انھوں نے اپنی زندگی کو تعمیر کر رکھا ہے یا جن بنیادوں پر تعمیر شدہ زندگی انھوں نے پہلے سے پائی ہے ان کے متعلق تحقیق کریں کہ وہ بجائے خود صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اور ان سے بہتر بنیادیں کہیں ان کو مل سکتی ہیں یا نہیں اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں میں بہت ہی کم آدمی ایسے ہیں جو نسلی، قومی، شخصی اور نفسیاتی تعصبات سے آزاد ہو کر خالص علمی تحقیق اور خالص معقولیت پر اپنے طرز فکر و عمل کی بنا رکھنے کے لیے آمادہ ہوں۔ اگرچہ اس کے مدعی آپ کو بہت ملیں گے۔

(۲) تناسخ کا عقیدہ ہندوؤں کے سوا بعض دوسری قوموں میں بھی پایا گیا ہے اور اب بھی پایا جاتا ہے اور ہندوستان سے باہر بھی بعض فلسفیانہ نظاموں میں اس کا نشان ملتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں جتنی زیادہ گہری جڑیں اس نے پکڑی ہیں اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس عقیدہ کی اصل دو سوال ہیں جن کو انسان نے ہمیشہ حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں آدمی کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ دنیا میں مصائب اور آفات (جن میں موت بھی شامل ہے) کیوں پائے جاتے ہیں؟ سراسر راحت، لذت، خوشی، سلامتی وعافیت اور ابدی زندگی ہی کیوں نہیں ہے اور دوسرا سوال یہ ہے کہ انسانی دماغ کے طبعی نتائج تو اس دنیا میں ایک مقرر ضابطہ کے تحت نکلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اخلاقی نتائج (جن کے ظاہر ہونے کا انسانی فطرت آپ سے آپ مطالبہ کرتی ہے) کیوں ایک مقرر ضابطہ کے مطابق ظاہر نہیں ہوتے۔ اگر وہ سب یا ان کا ایک جزء ظاہر ہونے کے لیے رکا ہوا ہے تو اس کے ظہور کی شکل کیا ہے؟

ان دونوں سوالات کے بہت سے مختلف جوابات مختلف فلسفیانہ نظاموں میں ملتے ہیں۔ مگر ان سب پر اس مختصر بحث میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان کے فلاسفہ نے جن کے تصورات آگے چل کر مذاہب کی شکل اختیار کر گئے۔ ان سوالات کو کرم اور تناسخ کے عقیدہ کی شکل میں حل کیا ہے وہ اس دنیا کو دارالامتحان کے بجائے ایک دارالعذاب اور ایک طرح کے جیل خانہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ حیاتِ جسمانی کو فی الاصل مصیبت سمجھتے ہیں اور جسم اور جسمانیت کے ساتھ ان کے تعلق کو اس بات کی وجہ قرار دیتے ہیں کہ روح قیدِ جسم سے چھوٹ چھوٹ کر بار بار پھر اسی قید خانہ میں واپس آتی ہے۔ ان کے نزدیک مصائب اور آفات اور آلام اور اسی طرح خوشحالیاں اور کامیاب زندگیاں، ان برے یا اچھے اعمال کا نتیجہ ہیں جو روح نے اس وقت کیے تھے جب وہ موجودہ زندگی سے پہلے قیدِ جسم میں تھی۔ مزید برآں ان کا خیال یہ ہے کہ اعمال کے جو اخلاقی نتائج ایک زندگی میں پوری طرح یا اپنی اصلی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے، ان کے ظہور کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اسی دنیا میں بار بار

آکر ان کو وصول کرتا رہتا ہے۔

یہ ایک وسیع نظامِ فکر ہے جس کا محض ایک خلاصہ میں نے یہاں بیان کیا ہے یہ پوری زندگی کے متعلق انسان کے نقطۂ نظر اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اس کے رویّہ کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے تمام فکری و عملی نتائج پر یہاں بحث کرنا مشکل ہے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ دراصل یہ قیاسی فلسفوں (SPXECULATIYA -PHILO- SOPHIES) کے قبیل کی چیز ہے اور اس قسم کے تمام فلسفیانہ نظامات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے سامنے جو مسائل آتے ہیں ان کو وہ محض تخیل اور منطق اور اٹکل سے کسی ایسے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کو اپنی حد تک اپنے پیشِ نظر مسائل کا اطمینان بخش اور دل کو لگتا ہوا جواب مل جائے۔ قطع نظر اس سے کہ علم، تجربہ، مشاہدہ اور آثارِ کائنات سے اس کی کوئی شہادت ملے یا نہ ملے قیاسی فلسفی اس شہادت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا - اسے تو فقط اپنے پیشِ نظر سوالات کا ایسا جواب درکار ہوتا ہے جس پر وہ اور اس کے طرز پر سوچنے والے لوگ مطمئن ہو جائیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایسے قیاسات کا امرِ واقعی اور حقیقت نفس الامری کے مطابق ہونا کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی بہت کم توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک تیر ہے جو اندھیرے میں اٹکل سے چلایا جاتا ہے۔ نشانے پر لگے یا نہ لگے۔ تیر چلانے والے کو خود بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ کسی جگہ اس کے لگنے سے "کھٹ" کی آواز بھی آتی ہے یا نہیں۔ اس کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اپنے قیاس سے اس نے جس کو نشانہ کا صحیح رخ سمجھا اس طرف اپنی حد تک ٹھیک ٹھیک شست باندھ کر تیر چلا دیا۔ ایسی تیراندازی کا نشانہ پر لگنا جتنا کچھ متوقع ہو سکتا ہے اتنی ہی کچھ قیاسی فلسفوں کے مطابقِ حقیقت ہونے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہت سے قائلین تناسخ خود بھی اپنے عقیدہ کی اس خامی کو محسوس کرتے ہیں اور یہ اسی کی تلافی کی کوشش ہے جو کبھی کبھی اخبارات میں کسی ایسی بچی یا بچے کے ظہور کی اطلاع کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے۔ جو اپنے پچھلے جنم کے حالات سناتی یا سناتا

ہے۔ لیکن اوّل تو یہی ایک عجیب بات ہے کہ ایسے بچے صرف ہندوؤں ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور ہند و اخبارات تک ہی ان کی خبر پہونچتی ہے۔

دوسری اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے فلسفہ کی تائید میں تجربہ و مشاہدہ کے فقدان کی تلافی کے لیے کہیں ایک آدھ ایسے بچے کی پیدائش کو کافی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان کے نظریہ کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ سارے ہی بچے ایسے پیدا ہوں۔ اگر وہ سزا یا جزا، جو انسان کو ایک جنم کے اعمال کی بناپر دوسرے جنم میں ملتی ہے۔ طبعی جزا و سزا نہیں بلکہ اخلاقی جزا و سزا ہے تو ہر انسان کو اس کا شعور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز کی جزا و سزا پارہا ہے کیونکہ تمام اخلاقی اعمال لازمی طور پر شعوری اعمال ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ بھی لازماً شعوری ہی ہونا چاہیے۔

اس طریق کے برعکس جن لوگوں نے عقل اور اس کے مطالبات اور فطرت اور اس کے تقاضوں اور آثارِ کائنات اور اس کے اشاروں کو نظر انداز کر کے ٹھیٹھ ظاہر بینی کے ساتھ، اور ایک بڑی حد تک مذہبی طرزِ فکر سے انکار کی خواہش کے ساتھ تجربہ و مشاہدہ پر اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے۔ انھوں نے پہلے سوال کی کنہ کو پہنچنے کی تو ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ اپنی تحقیق و رائے کو "کیوں ہے" کے سوال کے بجائے بڑی حد تک صرف "کیا ہے" کے سوال تک محدود رکھا رہا دوسرا سوال تو اس کے متعلق انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے نفس کو اس جواب ہی پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سارے اخلاقی نتائج بس اسی دنیا کی ایک ہی زندگی میں ظاہر ہو لیتے ہیں۔ جو موت پر ختم ہو جاتی ہے اور اگر بالفرض وہ ظاہر نہیں ہوتے تب بھی بہر حال موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے کیونکہ وہ براہِ راست ہمارے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آئی۔ لیکن انسان خواہ کتنی ہی کوشش کرے اس جواب سے اس کے قلب کا اطمینان کسی طرح ممکن نہیں۔

اب رہا یہ امر کہ انبیاء علیہم السّلام کے لائے ہوئے دین میں ان دونوں سوالات کا کیا جواب ہے اور وہ کن دلائل سے معقول ترین جواب ہے، تو اس پر میں اپنے مضامین مثلاً رسالہ دینیات اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، زندگی بعد موت، اسلام اور جاہلیت اور تفسیر سورۂ

اعراف میں تفصیل کے ساتھ بحث کرچکا ہوں لہٰذا یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔
البتہ یہ بات واضح کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام مابعد الطبیعیاتی مسائل میں یہ اصول مشترک ہے کہ ان کا کوئی حل بھی، خواہ وہ نفی کی شکل میں ہو یا اثبات کی شکل میں، ایسا قطعی الثبوت نہیں ہو سکتا جیسے دو اور دو کا چار ہونا قطعی الثبوت ہے کہ اس کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسے مسائل کا زیادہ سے زیادہ معقول حل جس کے مطابق حقیقت ہونے کا اغلب گمان کیا جاسکتا ہو صرف وہی ہو سکتا ہے جو عقل اور فطرت کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ جس کی طرف آثار کائنات اور تجربات و مشاہدات میں واضح اشارات پائے جاتے ہوں۔ جس سے زندگی کے ان تمام مسائل کو حل کیا جاسکتا ہو جو اس خاص مسئلہ سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے ہیں جس پر عقلاً کسی اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ جس کے مان لینے سے کچھ دوسرے ناقابل حل مسائل نہ پیدا ہوتے ہوں۔ جس کے ماننے سے کچھ ایسی قباحتیں نہ پیدا ہوتی ہوں جنھیں کسی دوسرے طریقہ سے رفع کرنا ممکن نہ ہو اور جس کے خلاف کوئی ثبوت نہ دیا جاسکتا ہو۔ عقل زیادہ سے زیادہ ان سوالات کے کسی حل کو اغلب (MOST PROBABLE) سمجھنے کی حد تک ہی ہمیں لے جاسکتی ہے۔ اس کے آگے یقین حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ایسا حل پیش کرنے والوں کی زندگیوں کو ان کے پیش کردہ پورے نظامِ فکر و عمل کی معقولیت کو اور ان کے کام اور اس کے نتائج کو دیکھ کر ان پر ایمان بالغیب لایا جائے۔

(۲) گرنتھ صاحب کا مطالعہ میں نے خود تو نہیں کیا ہے لیکن جس حد تک میں نے مطالعہ کرنے والوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کی بنا پر میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ سکھ مذہب محض ایک صوفیانہ مذہب ہے اور اس میں انسان کی زندگی کے بڑے بڑے مسائل مثلاً تمدن و معاشرت، سیاست و معیشت، عدالت و قانون، صلح و جنگ وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں ہے جس پر دنیا میں ایک سوسائٹی اور ایک اسٹیٹ کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن جس وجہ سے سکھوں کے تعلیم یافتہ اور صاحبِ فکر و فہم لوگ اپنی جستجوئے حق اور تلاشِ ہدایت کو معطل کیے ہوئے اس مذہب پر قانع ہیں

اس کی تشریح میں پہلے سوال کے جواب میں کرچکا ہوں۔

(ترجمان القرآن ۶۵ھ جنوری ۴۶ء)

علم ظاہر اور علم باطن

سوال:۔

اسلاف کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "علم باطنی" ایک ایسا علم ہے جو قرآن و حدیث وغیرہ علوم سے جدا محض ریاضت و مجاہدات سے حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ امتِ مسلمہ میں بکثرت انسان ایسے ہوئے ہیں جن کو دو زندگیوں میں تربیت ملتی ہے کہ پہلے انھوں نے کتاب و سنت اور فقہ و کلام وغیرہ علوم کی تحصیل کی اور ان کو "علم ظاہری" کا خطاب دیا۔ اس کے بعد "علوم باطنی" کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لیے سخت ریاضتیں کیں۔ تب کہیں جا کر انھیں "روحانی علوم" حاصل ہوئے اور ان کو انھوں نے ہمیشہ علوم ظاہری پر ترجیح دی۔ براہِ کرم کچھ اس پر روشنی ڈالیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم باطنی کی کیا تعریف ہے؟ اس کی حقیقت کیا تھی؟ اس میں کتنی رنگ آمیزیاں ہوئیں؟ کیا یہ علم ریاضت و مجاہدات کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور کیا علومِ ظاہری کی تحصیل کے بغیر بھی یہ علم حاصل ہوسکتا ہے؟

جواب:۔

آپ کا سوال بہت تفصیل طلب ہے، اس کے مختلف پہلوؤں پر میں بارہا اپنے مضامین میں روشنی ڈال چکا ہوں اگرچہ براہِ راست اس خاص موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے۔

ظاہر سے مراد اگر احکامِ شریعت ہوں اور باطن سے مراد حکمتِ دین۔ یا ظاہر سے مراد احکام شرعی کی تعمیل ہو اور باطن سے مراد یہ ہو کہ آدمی اس اعتقادی و اخلاقی روح کو سمجھے اور اپنے نفس اور سیرت و کردار میں اسے جاری و ساری کرے جو احکام شرعی کی تعمیل میں

درحقیقت مطلوب ہے تو یقیناً ظاہر اور باطن کی یہ تفریق درست ہے لیکن اس تفریق کے لحاظ سے باطن کا سرچشمہ بھی وہی ہے جو ظاہر کا سرچشمہ ہے یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ یہی تلاوتِ قرآن، یہی سیرتِ پاک، اور یہی صوم و صلوٰۃ اور دوسرے شرعی احکام کی تعمیل۔ جس طرح ظاہر کی اصلاح کے لیے کافی ہے اسی طرح باطن کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے۔ اس غرض کے لیے ان چیزوں سے الگ کسی مجاہدہ و ریاضت کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر باطن سے مراد وہ فلسفے ہیں جو یونان اور روم اور ایران اور ہند سے آئے ہوئے تصوّف کے نام سے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تو وہ چاہے جس چیز کا باطن بھی ہوں، بہرحال اسلام کا باطن تو نہیں ہیں۔ جو مشقتیں اور ریاضتیں اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ان فلسفوں کی رو سے جس شے کو "حقیقت" سمجھا گیا ہے اس کا مشاہدہ حاصل ہو۔ اور آدمی کشف اور خرقِ عادت اور صدورِ عجائب پر قادر ہو جائے۔ ان کی شکلیں چاہے اسلامی نماز روزے سے ملتی جلتی ہی کیوں نہ ہوں۔ اور ان میں اسلامی اصطلاحات کا استعمال ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو، بہرحال وہ اسلامی عبادات کی تعریف میں نہیں آتیں۔ کیونکہ ان کی غرض اسلامی عبادات کی غرض سے، اور ان کا ضابطہ سنت نبوی کے مقرر کردہ ضابطہ سے مختلف ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

حبش پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ

سوال:۔

مصر کے مفتوح ہو جانے کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں حبش کی جانب فتوحات کے لیے قدم کیوں نہ بڑھایا گیا؟ کیا محض اس وجہ سے کہ وہاں کے ایک سابق حکمران نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ایک سابق بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا؟"

جواب: اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس مکمل مواد موجود نہیں ہے

البتہ ابوداؤد اور مسند احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرمادی تھی کہ دعوا الحبشۃ ما ترکوکم دوسری روایت کے الفاظ ہیں اترکوا الحبشۃ ما ترکوکم "یعنی حبش کے لوگ جب تک تمہیں چھوڑے رکھیں تم بھی انھیں چھوڑے رکھو" معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے دور میں حبش کی جانب کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس ارشاد میں جو مصلحت تھی، ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا لحاظ بھی ہو کہ اہل حبش نے مسلمانوں کو ان کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی۔ اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے ان کے خلاف پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو سکے کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ حبش کی جغرافی پوزیشن، اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرمایا ہوگا کہ اسلام کے جغرافی مرکز یعنی حجاز کے تحفظ کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا ضروری ہے اسی مصلحت سے آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی ہوگی کہ جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُرامن طریقہ سے اس ملک میں پھیلائی جاتی رہے۔ لیکن جنگ سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔

(ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۶۳ھ، جولائی، اگست ۴۴ء)

کائناتی اور حیاتی ارتقاء

سوال:۔

" آپ نے رسالہ ترجمان القرآن جلد ۸ عدد ۶ صہ ۳۹۶ تا صہ ۳۹۷ میں اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے زیر عنوان نظام عالم کے انجام کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے سمجھنا چاہتا ہوں، آپ نے لکھا ہے کہ "اس نظام کے تغیرات و تحولات کا رخ ارتقاء کی جانب ہے۔ ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں وغیرہ"۔ آخر یہ کس قسم

کا ارتقاء ہے؟ حیوانی زندگی میں؟ جماداتی یا انسانی زندگی میں؟ یا مجتمعاً تمام نظام عالم کی زندگی میں یہ ارتقاء کارفرما ہے؟ نیز اگر ہر بگاڑ سے ارتقائی اصلاح ظاہر ہوتی ہے تو پھر تو وہی بات ہوئی جو ہیگل نے (THESIS AND ANTI THE SIS) اور ڈارون نے (SURVIVAL OF THIFITTEST) میں پیش کی ہے۔ براہِ کرم مدعا کی وضاحت کیجئے۔"

جواب:۔

جس ارتقاء کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ہیگل اور ڈارون دونوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ ہیگل تو تصورات اور خیالات کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسی نزاع کی بدولت تصوّرات کا ارتقاء ہوتا ہے اور ڈارون حیات کی ارتقاء کا ذکر کرتا ہے اور اس کے نزدیک یہ ارتقاء تنازع للبقا (STRUGGLE FOR EXISTENCE) انتخاب طبعی (NATURUL SELECTION) اور بقائے اصلح (SURVIVAL OF THIFITTEST) کے اصول سہ گانہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی کمتر درجہ کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند تر درجہ کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے، اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات اور حیوانات بھی کمتر درجہ کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بحیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے یعنی موجودہ نظامِ عالم بہ حیثیت مجموعی ناقص ہے، لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم ہونا چاہیے۔ جو اس سے کامل تر ہو اور اسی نظام کا نام عالمِ آخرت ہے۔ گویا میرے نزدیک موجودہ نظامِ عالم کے بعد عالمِ آخرت کا آنا قدرت کے قانون ارتقاء کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۷۴ھ، جنوری، فروری ۵۵ء)

معاشی مسائل

سرکاری نرخ بندی پر چند سوالات

سوال:-

حکومت ایک جماعت کو کچھ اشیاء ارزاں قیمت پر مہیا کرتی ہے دوسری جماعت کے افراد اس رعایت سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ پھر کیا موخرالذکر طبقے کا کوئی فرد پہلی جماعت کے کسی فرد کے ذریعہ حکومت کی اس رعایت سے استفادہ کرسکتا ہے۔ مثلاً مروّت یا دباؤ سے رعایت پانے والی جماعت کا کوئی فرد محروم رعایت جماعت کے کسی فرد کو کوئی چیز اپنے نام سے کم قیمت پر خرید سکتا ہے؟ یا اس کی کسی پرانی چیز کو نئی چیز سے بدلوانے کا شرعاً مجاز ہے:-

جواب:-

آپ نے جس معاملہ کا ذکر کیا ہے وہ دراصل دو مختلف پہلو رکھتا ہے۔ جن کا حکم الگ الگ ہے۔

اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی خاص گروہ کے لیے نرخوں میں جو رعایت کی گئی ہے اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ یہ بات حکومت کے قانون کی رو سے ناجائز ہو تو ہو اخلاقاً اس میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت اس وقت قیمتوں کا چڑھاؤ کسی اصلی گرانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک مصنوعی چڑھاؤ ہے جو حکومت اور ملک کے سرمایہ دار طبقے نے بالکل ارادۃً پیدا کیا ہے[1]۔ عام باشندے اس گرانی سے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت کردیے گئے ہیں بعض خاص گروہوں کے ساتھ جو رعایت کی جارہی ہے درحقیقت تمام باشندگانِ ملک اس کے مستحق تھے۔ لیکن حکومت نے ملک میں عام گرانی پیدا کرکے اپنی خاص خدمات انجام دینے والوں کے لیے کچھ رعائتیں اس غرض سے رکھدی ہیں کہ ان رعایتوں کے

---

[1] واضح رہے کہ یہ جنگ کا زمانہ تھا۔

لالچ سے لوگوں میں ان خدمات کی طرف میلان پیدا ہو اور جن خادموں کے ساتھ یہ رعایات کی گئی ہیں وہ حکومت کے احسان مند ہوں۔ یہ غرض بجائے خود نا جائز ہے۔ اس لیے اگر کوئی اس بندش میں رخنہ پیدا کرے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کس اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کا مجرم ہوگا۔ تاہم زبردستی کا قانون ایک الگ چیز ہے جس کے لیے کسی اخلاقی بنیاد کی ضرورت نہیں۔

معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پرانی چیز دے کر کسی خفیہ طریقہ سے نئی چیز اس کے بدلے میں حاصل کر لی جائے۔ یہ البتہ ایک خلافِ اخلاق فعل ہے جس سے ہر ایماندار آدمی کو اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال:۔

آج کل کنٹرول کا زمانہ ہے مگر کوئی مال دوکاندار کو کنٹرول نرخ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ وہ چور بازار (BLACK MARKET) سے مال خرید کر گاہکوں کو سپلائی کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے مال کو کنٹرول ریٹ پر بیچنے میں اسے خسارہ ہوتا ہے لامحالہ وہ زیادہ نرخ لگاتا ہے اگر بعض لوگ اس خرید و فروخت کو بے ایمانی اور فریب قرار دیتے ہیں اور پولیس بھی اس پر گرفت کرتی ہے۔ اس باب میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔

اخلاقی حیثیت سے حکومت کو تسعیر (نرخ بندی) (PXICR CANTRAL) کرنے کا اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنی مقرر کردہ قیمتوں پر لوگوں کو مال دلوانے کا انتظام نہ کرے اس چیز کا انتظام کیے بغیر محض اشیاء کے نرخ مقرر کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے پاس اشیاء کے ذخائر ہوں وہ ان کو چھپا دیں اور پھر یا تو ان کو بیچنا بند کر دیں۔ یا قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے خفیہ طور پر زائد قیمتوں پر بیچیں۔ جو حکومت اس نتیجہ سے محض عقلاً ہی واقف نہیں ہے بلکہ تجربے اور مشاہدے کی رو سے بھی واقف ہو چکی ہے۔ وہ اگر اس پر بھی نرخ مقرر کرنے کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اسے اخلاقاً یہ مطالبہ

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ عام خریدار اور بیوپاری اس کے مقرر کردہ نرخوں کی پابندی کریں۔

اس وقت یہ صریح طور پر نظر آرہا ہے کہ عام خریدار اور چھوٹے چھوٹے خردہ فروش تاجر اگر بڑے صاحب ذخیرہ تاجروں سے حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو انھیں کچھ نہیں ملتا اور اگر وہ ان سے چور بازار کی قیمتوں پر مال خریدتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں رہتا کہ اسی مال کو آگے کھلے بازار میں حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر فروخت کر سکیں۔ ایسی حالت میں جو شخص اپنی روزی کمانے یا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے چور بازار سے مال خریدتا ہے وہ ہرگز کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر وہ آگے اس طرح کے مال کو سرکاری نرخ سے زیادہ قیمتوں پر فروخت کرتا ہے تب بھی وہ کسی قاعدے سے اخلاقی مجرم نہیں ہے۔ ایسے شخص کو گرفتار کر کے اگر اسے سزا دی جائے گی تو یہ حکومت کا مزید ایک ظلم ہوگا۔

جماعت اسلامی کے ارکان میں سے جو لوگ تاجر ہیں انھیں ایسی صورت پیش آئے تو ان کو چاہیے کہ کچہری میں وکیل کے بغیر حاضر ہوں۔ معاملہ کی اس صورت کو صاف صاف مجسٹریٹ کے سامنے رکھدیں اور پھر بلا تامل اس سے کہیں کہ اگر اس صورت حال میں بھی آپ کی حِسِ انصاف ہمیں مجرم سمجھتی ہے تو ضرور سزا دیجیے۔ ہم آپ کی ان عدالتوں سے بالاتر ایک عدالت سے توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار وہ ہمارا اور آپ کا انصاف ضرور کرے گی۔

"تسعیر" کے سلسلہ میں چونکہ ذکر آگیا ہے اس لیے میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں اسلام کی پالیسی کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں قیمتیں چڑھ گئیں لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ قیمتیں مقرر فرمادیں۔ آپؐ نے جواب دیا:

ان السعر غلاؤہ	قیمتوں کا چڑھنا اور گرنا اللہ کے ہاتھ میں
ورخصہ بید اللہ	ہے (یعنی قدرتی قوانین کے تحت
وانی ارید القی اللہ ولیس	ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے

لاحد عندی مظلمة یطلبنی بہا۔	ملوں تو اس حال میں ملوں کہ کوئی شخص میرے خلاف ظلم و بے انصافی کی شکایت کرنے والا نہ ہو۔

اس کے بعد آپؐ نے مسلسل اپنے خطبوں میں، بات چیت میں اور لوگوں سے ملاقاتوں میں یہ فرمانا شروع کیا کہ:۔

الجالب مرزوق والمحتکر ملعون	ضروریاتِ زندگی کو بازار میں لانے والا خدا سے رزق اور رحمت پاتا ہے اور ان کو روک رکھنے والا خدا کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔
من احتکر طعاماً اربعین یوماً یرید بہ الغلاء بریٔ من اللہ وبریٔ اللہ منہ	جس نے چالیس دن تک غلّہ روک کر رکھا تاکہ قیمتیں چڑھیں تو اللہ کا اس سے اور اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔
بئس العبد المحتکر ان ارخص اللہ الاسعار حزن وان اغلاھا فرح	کتنا برا ہے وہ شخص جو اشیاء ضرورت کو روک کر رکھتا ہے ارزانی ہوتی ہے تو اس کا دل دکھتا ہے گرانی بڑھتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔
من احتکر طعاماً اربعین یوما ثم تصدق بہ لم یکن لہٗ کفارۃ۔	جس نے چالیس دن تک غلّہ کو روک رکھا پھر اگر وہ اس غلّہ کی خیرات بھی کر دے تو اس گناہ کی تلافی نہیں کرے گا جو ان چالیس دنوں کے دوران میں وہ کر چکا ہے۔

اس طرح نبیؐ احتکار کے خلاف مسلسل تبلیغ و تلقین فرماتے رہے یہاں تک کہ تاجروں کے نفس کی اصلاح خود بخود ہوگئی اور جو ذخیرے روکے گئے تھے وہ سب بازار میں آ گئے۔

یہ شان ہے اس حکمراں کی جس کی حکومت اخلاق فاضلہ کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس کی اصل قوت پولیس اور عدالت اور کنٹرول اور آرڈی نینس نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانوں کے قلب وروح کی تہوں میں برائی کی جڑوں کا استیصال کرتا ہے، نیتوں کی اصلاح کرتا ہے۔ خیالات اور ذہنیتیں بدلتا ہے۔ معیار قدر بدلتا ہے اور لوگوں سے رضا کارانہ اپنے ان احکام کی پابندی کراتا ہے جو بجائے خود صحیح اخلاقی بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے یہ دنیوی حکام جن کی اپنی نیتیں درست نہیں ہیں جن کے اپنے اخلاق فاسد ہیں اور جن کی حکمرانی کے لیے جابرانہ تسلط کے سوا کوئی دوسری بنیاد بھی موجود نہیں ہے انھیں جب کبھی اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جیسے آج کل در پیش ہیں تو یہ سارا کام جبر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اخلاق کی اصلاح کرنے کے بجائے عامۃ الناس کے اخلاقی بگاڑ میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے۔ اسے بھی پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

سرکاری نرخ بندی کے سلسلے میں ایک مزید سوال

سوال:۔

آڑھت کے سلسلہ میں ہم کو گندم خریدنی پڑتی ہے گندم کی خرید وفروخت کے لیے اس وقت کنٹرول ریٹ مقرر ہے لیکن اس مقررہ نرخ پر گندم ملنی ممکن نہیں ہے۔ منڈی کے تمام بیوپاری قدرے گراں نرخ سے خرید وفروخت کرتے ہیں۔ مگر رجسٹروں میں اندراج کنٹرول ریٹ کے مطابق کرتے ہیں۔ دوکاندار خرید وفروخت میں کنٹرول ریٹ سے زائد جو قیمت لیتا دیتا ہے اس کا حساب دوکاندار کے کھاتوں سے نہیں بلکہ اس کی جیب سے متعلق ہوتا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ کیا اپنے استعمال کے لیے اور تجارت کے لیے اس ڈھنگ پر گندم خریدنا جائز ہے؟ نیز

یہ امر بھی واضح ہونا چاہیئے کہ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ عدالت کی گرفت میں آجائے جس کا ہر وقت امکان ہے تو کیا یہ جائز ہوگا کہ عدالت میں یہی کھاتے کے جھوٹے اندراجات کے مطابق بیان دیا جائے۔ واضح رہے کہ سچ بولنے سے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت عدالت مقررہ سزا نافذ کردے گی۔

جواب :-

ان حالات میں آپ اپنے استعمال کے لیے تو بہرحال گیہوں خرید ہی سکتے ہیں کیونکہ اس صورت میں حساب رکھنے کا کوئی سوال نہیں ہے البتہ دوکان کے معاملہ میں ایک قباحت یہ ہے کہ جس بھاؤ سے فی الواقع مال خریدا جاتا ہے اس کا کھاتے میں اندراج پُرخطر بنا دیا گیا ہے۔ اگر اس کاروبار سے بچنے کی کوئی صورت ہو تو بہتر ہے اور اگر آپ کے لیے بس یہی ایک ذریعہ معاش ہو اور اس کے سوا کسی دوسرے کام سے رزق پیدا کرنا آپ کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر جائز طور پر جو طریق کار آپ اختیار کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے حسابات اپنے واقعی لین دین کے مطابق ہی رکھیں اور جب گرفتار کیے جائیں تو عدالت میں ٹھیک ٹھیک بیان دیدیں عدالت سے صاف کہیئے کہ اس حکومت نے اپنی غلط پالیسی سے پورے ملک کو جھوٹا بننے پر مجبور کردیا ہے۔ کنٹرول کیا تھا تو کنٹرول ریٹ پر اشیاء ضرورت کی فراہمی کا ذمہ بھی اس کو لینا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے یہ انتظام تو کیا نہیں اور نرخ مقرر کردیئے۔ اب اگر ہم اس کے مقرر کیے ہوئے نرخوں کے مطابق مال خریدنے پر اصرار کرتے ہیں تو بازار سے ضرورتِ زندگی فراہم کرنا غیر ممکن ہے کنٹرول ریٹ کا نام لیا جائے تو بائع سرے سے مال ہونے کا ہی انکار کردیتا ہے اور بلیک مارکیٹ سے اپنی ضروریات پوری کی جائیں تو آپ گلا دبانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ بہرحال ہم نے جتنے میں مال خریدا ہے ہم تو وہی ظاہر کریں گے۔ آپ کے قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنے کی وہ پالیسی ہم اختیار نہیں کرسکتے جو ملک کے لاکھوں کروڑوں باشندوں نے مجبوراً اختیار کر رکھی ہے۔ آپ کا انصاف اگر ہمیں مجرم سمجھتا ہے تو ضرور سزا دیجئے۔ مگر انصاف کے جن

اصولوں سے انسانی عقل عام واقف ہے ان کی رو سے تو کنٹرول آرڈیننس جاری کرنے والے بزرگ سے لے کر نیچے تک وہ سارا عملہ بھی قابلِ سزا ہے جو ان احکام کو نافذ کر رہا ہے اور جس کی زبردستی سے سارا ملک جھوٹ اور بے ایمانی کے طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ (ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

بکری ٹیکس

سوال:۔

میں بزازی کا کاروبار کرتا ہوں۔ یکم اپریل ۴۸ء سے ہم پر بکری ٹیکس لگایا گیا ہے اور ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ٹیکس اپنے گاہکوں سے وصول کریں۔ لیکن عام دکاندار نہ تو گاہکوں سے یہ ٹیکس وصول کرتے ہیں اور نہ خود ادا کرتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنی روزمرہ کی اصل فروخت کا حساب وہ اپنے باقاعدہ رجسٹروں میں درج ہی نہیں کرتے۔ حکومت کے کارندوں کو وہ اپنے فرضی رجسٹر دکھاتے ہیں اور جب ان کے رجسٹروں پر کسی شک کا اظہار کیا جاتا ہے تو رشوت سے منہ بند کر دیتے ہیں۔ دوسرے دوکانداروں کے لیے تو یہ جعل اور رشوت آسان ہے مگر ایک ایماندار تاجر کیا کرے؟۔ وہ خریداروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے تو اس کا مال فروخت نہیں ہوتا، کیونکہ پاس ہی ایک ایسا دوکاندار بیٹھا ہے جو ٹیکس لیے بغیر اس کے ہاتھ مال فروخت کرتا ہے اور اگر وہ خریدار سے ٹیکس وصول نہیں کرتا تو اسے اپنے منافع میں سے یہ ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ اس صورت میں بسا اوقات اسے کچھ نہیں بچتا۔ بلکہ بعض چیزوں میں تو نفع اتنا کم ہوتا ہے کہ پورا نفع دے دینے کے بعد تاجر کو کچھ اپنی گرہ سے بھی دینا پڑ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم تجارت چھوڑ دیں یا فرضی حسابات رکھنے

شروع کر دیں؟

مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم جو صحیح حسابات رکھتے ہیں انھیں بھی سرکاری کارندے فرضی سمجھتے ہیں کیونکہ جہاں تنانوے ۹۹ فی صدی تاجروں کے حسابات فرضی ہوں وہاں ایک فی صدی کے متعلق انھیں یقین نہیں آتا کہ اس کا حساب صحیح ہوگا۔ اس لیے وہ اپنے قاعدے کے مطابق ہماری بکری کا اندازہ بھی زیادہ لگا کر ہم سے زیادہ ٹیکس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اب کیا ہم اس سے بچنے کے لیے انھیں رشوت دیں؟ یا ایمانداری کی پاداش میں زائد ٹیکس کا جرمانہ بھی ادا کریں؟"

جواب:۔

یہ سوال دراصل ہم سے نہیں بلکہ حکومت سے کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کی پیدا کی ہوئی مشکلات کا حل خود اسی کو تجویز کرنا چاہیے اس نوعیت کے سوالات اگر اس کے پاس بھیجے جائیں تو کیا عجب کہ ذمہ دارانِ حکومت کا ضمیر انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ ان کے طریق کار میں آخر وہ کیا غلطی ہے۔ جس کی وجہ سے ساری قوم کو جھوٹ خیانت اور بے ایمانی کی تربیت مل رہی ہے۔

پھر یہ بھی ایک قابلِ غور معاملہ ہے کہ پہلے تو ایک بیرونی قوم اپنے مفاد کے لیے ہم پر حکومت کر رہی تھی۔ اس لیے لوگوں کو نہ اس پر اعتماد تھا نہ اس سے کوئی دلچسپی اور محبت تھی اور نہ اس کا کوئی حق وہ اپنے اوپر مانتے تھے۔ مگر اب تو وہ پاکستان بن چکا ہے جس کے عشق میں ساری قوم برسوں سے دیوانہ ہو رہی تھی اور اس کا انتظام وہ لوگ سنبھالے ہوئے ہیں جو قوم کے محبوب رہنما تھے۔ اب کیا بات ہے کہ اسی پاکستان کا نظم ونسق چلانے اور اسے مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لیے جب ٹیکس لگائے جاتے ہیں تو قوم کی بہت بڑی اکثریت ان کو ادا کرنے سے جی چراتی ہے، کیا اس کی وجہ محض قوم کی بے حسی اور نالائقی ہے؟ یا اس میں کچھ ہمارے سربراہ کاروں کی اپنی کوتاہیوں کا بھی دخل ہے؟ اگر ٹیکس دینے والا یہ دیکھتا ہے کہ پاکستان کے

لیے جس ایثار و قربانی کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے اسی ایثار سے حکومت کے کارفرما حضرات خود بھی کام لے رہے ہیں اور اگر ٹیکس دینے والے کو یہ اطمینان ہو تاکہ جو کچھ اس سے لیا جا رہا ہے وہ واقعی اس کی اور ملک کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتا ہے نہ کہ چند لوگوں کی عیاشیوں پر، تو کیا پھر بھی وہ اپنی حکومت کے مصارف میں حصہ لینے سے یونہی گریز کرتا؟

سائل کو اور اس جیسے تمام ایماندار تاجروں کو میرا مشورہ ہے کہ اول تو وہ حکومت کے ٹیکس پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کریں لیکن اگر یہ بالکل ناممکن ہو جائے اور اس طرح ان کے لیے اپنا پیٹ پالنا بھی مشکل ہو جائے تو پھر وہ صرف اس حد تک عام دکانداروں کی تقلید کر سکتے ہیں کہ اپنی بکری کا ایک حصہ رجسٹروں میں درج کریں اور ایک حصہ درج نہ کریں مگر سرکاری کارندوں کے سامنے انھیں جھوٹ نہ بولنا چاہیے۔ نہ ان کو رشوت دینی چاہیے۔ بلکہ ان سے صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمارے حسابات ادھورے ہیں اور ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ آپ ہم پر مقدمہ چلا دیں۔ پھر اگر مقدمہ چلایا جائے تو انھیں عدالت کے سامنے بازار کی تمام صورتِ حال صاف صاف بیان کر دینی چاہیے۔ اور یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ان حالات نے ایک ایماندار تاجر کے لیے روٹی کمانا کس قدر دشوار کر دیا ہے۔ کاش کچھ صاحبِ ہمت لوگ ایسے ہوں جو اس طریقہ پر عمل کر گزریں۔ اس طرح قوم کے ضمیر کو یہ احساس دلانا آسان ہو گا کہ موجودہ غلط نظامِ حکومت کی وجہ سے کس طرح ایمانداری خطا اور بے ایمانی صواب بن کر رہ گئی ہے۔ (ترجمان القرآن، شوال ۶۷ھ، اگست ۴۸ء)

مکانوں کے کرایوں میں بلیک مارکٹنگ

سوال:۔

جس مکان میں میں رہتا ہوں۔ وہ مجھ سے پہلے ایک کرایہ دار نے ۴۵ روپے ماہانہ کرائے پر مالک مکان سے اس شرط پر لیا تھا کہ دو ماہ کے نوٹس پر خالی کر دیں گے۔ ان کرایہ دار سے یہ مکان اسی شرط پر میرے بھائی

نے لیا اور میں بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔ دو ماہ بعد میرے کہنے پر مالکِ مکان میرے نام سے رسید کاٹنے لگے۔ آٹھ ماہ تک ہم برابر پینتالیس روپے ماہانہ ادا کرتے رہے اور اس دوران میں کرایہ کی زیادتی ہمارے لیے سخت موجب تکلیف رہی اور کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ رینٹ کنٹرولر کے یہاں درخواست دے کر کرایہ کم کرایا جائے مگر اس صورت پر دلی اطمینان نہیں ہو سکا۔ ستمبر میں مالکِ مکان کو سفیدی وغیرہ کرانے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو کرایہ دار کے فرائض میں سے ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے اپنا سکوت توڑتے ہوئے یہ کہا کہ دو ماہ بعد جواب دوں گا۔ (شاید مکان خالی کرانے کی دھمکی اس جواب میں مضمر تھی) اس پر کسی قدر تیز گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں میں نے رینٹ کنٹرولر کے یہاں کرایہ تشخیص کرنے کی درخواست دے دی۔ وہاں سے سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے کرایہ مقرر کر دیا گیا، مگر میرا ضمیر اس پر اب بھی مطمئن نہیں ہے۔

جن صاحب کے ذریعے یہ مکان حاصل ہوا تھا۔ ان کے اور ان کے عزیزوں کے کہنے سننے سے میں نے یہ صورت منظور کر لی کہ پینتیس روپے ماہوار میں اس شرط پر دوں گا کہ میں مکان میں جب تک چاہوں رہوں لیکن اگر کبھی مالکِ مکان نے مکان خالی کرایا تو پھر شروع سے کرایہ سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے محسوب ہوگا اور زائد وصول شدہ رقم مالک مکان کو واپس کرنی ہوگی۔ مالک مکان فی الوقت اس شرط پر راضی نہیں ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ ان کو راضی ہونا پڑے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لیے کون سی صورت صحیح ہوگی؟ کیا میں پینتالیس روپے ماہوار دیتا رہوں یا سولہ روپے گیارہ آنے ادا کروں۔ نیز کیا میرے لیے ضروری ہے کہ جب

مالک مکان، مکان کو خالی کرنے کا مطالبہ کرے تو لازماً خالی کردوں. یا اس امر واقعہ کو جانتے ہوئے کہ اسے مکان کی خود ضرورت نہیں ہے. بلکہ محض کرایہ بڑھانے کے لیے دوسرے کرایہ دار کو دینا مطلوب ہے. میرے لیے جائز ہے کہ میں مطالبہ کی تعمیل سے انکار کردوں؟ واضح رہے کہ مکانوں کی غیر معمولی قلت کی بنا پر پینتالیس کے بجائے پچاس روپے دینے والے کرایہ دار بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے صاف اور دوٹوک جواب دیا جائے. جواب میں لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں مالک مکان کو نصیحت کروں یا اس کا ظلم اس پر واضح کروں. کیونکہ یہ چیز بے کار ہوگی۔

جہاں تک مجھ سے ہوسکا ہے، حقیقت واقعہ جیسی کچھ ہے. میں نے صاف صاف عرض کردی ہے۔

جواب:۔

موجودہ حالات میں بڑے شہروں کے مالکان مکان مکانات کی قلت سے اور لوگوں کی خصوصاً مہاجرین کی حاجت مندی سے انتہائی ناجائز فائدے اٹھانے پر تل گئے ہیں. ان کے ساتھ اگر کوئی شخص معاہدہ کرتا بھی ہے تو برضا ورغبت نہیں کرتا بلکہ اسی طرح کی مجبوری سے کرتا ہے جیسی سود پر قرض لینے والے حاجت مند کو لاحق ہوتی ہے اس لیے ایسے معاہدات کی کوئی اخلاقی قدر وقیمت نہیں ہے اور درحقیقت یہ معاہدے اس وجہ سے ہو رہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے انصاف قائم کرنے اور لوگوں کی ضروریات منصفانہ شرائط پر بہم پہونچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اب اگر حکومت نے منصفانہ کرائے مقرر کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور دوسرے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں. جس مکان کا کرایہ ازروئے انصاف سولہ روپے ہے اگر ایک مالکِ مکان اس کا کرایہ پینتالیس روپے وصول کرتا ہے تو یقیناً وہ لٹیرا ہے وہ آخر کون سا اخلاقی حق رکھتا ہے کہ آپ پر اس کا احترام کرنا واجب ہو. کل جو شخص غلہ کی کمی کی وجہ سے بلیک مارکٹنگ کرنے پر اتر آئے اور اپنا دس روپے من خریدا ہوا غلّہ

اسّی روپے من کے حساب سے بیچنے لگے تو کیا اس کے بھی حقوق ملکیت کا احترام کیا جائے گا؟ اگر ہم حکومت کی مدد سے ایسے لوگوں کو مناسب شرح پر اپنا مال بیچنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں؟

اسلامی اصولوں پر بنکنگ کی ایک اسکیم

سوال:-

اسلامی اصول پر ایک غیر سودی بنک چلانے کے لیے ایک اسکیم بھیجی جارہی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرما کر ہماری رہنمائی کیجئے کہ کیا شرعاً یہ اسکیم مناسب ہے؟ یا اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے؟

اسکیم کا خلاصہ:-

مسلمان زمین دار، تجار اور اہل حرفہ مدتوں سے ساہوکاروں کے پنجے میں پھنستے جارہے ہیں اور ۲۵۔ ۲۵ فی صدی تک سود ادا کرتے کرتے تباہ ہو رہے ہیں۔ بڑے تاجر اور زمین دار تو خیر بری بھلی طرح پنپ بھی رہے ہیں لیکن کم استطاعت مسلمانوں کا حال سودی قرضوں نے بہت ہی پتلا کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک مسلم بنک مسلمانوں کو غیر سودی قرض دینے اور زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام کرنے کے لیے قائم ہو۔ ابتداءً ایک ضلع میں اس کا تجربہ کیا جائے اور پھر ملک بھر میں اسے پھیلا دیا جائے۔ مجوزہ بنک کے لیے ذیل میں چند اصول و مبادی درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) یہ بنک قانون شریعت کا پورا پورا پابند ہوگا اور مفرد اور مرکب ہر طرح کے سود سے دامن پاک رکھ کر کاروبار کرے گا۔ اس بنک سے حاجت مند مسلمانوں کو جائدادی کفالتوں پر اور تجارت پیشہ لوگوں کو مضاربت کے اصول پر کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔ قرض دار کو از روئے

معاہدہ اس امر کا پابند ہونا پڑے گا کہ وہ اپنے اموال اور کاروباری سرمائے پر ایک خاص عرصہ تک باقاعدگی سے بنک کو زکوٰۃ ادا کرے۔ اس طریقے سے ایک تو بلا سود سرمایہ حاصل کر کے مسلمان تاجر یا صنّاع اپنا کاروبار بخوبی چلا سکے گا اور اپنے سرمایہ پر سود ادا کرنے والے غیر مسلم حریفوں کا بخوبی مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا اور دوسری طرف نظام زکوٰۃ کے احیاء میں وہ حصہ دار بنے گا جس کے مٹ جانے کی وجہ سے ہمارے عوام کی غریبی اور بے روزگاری لاعلاج ہو کے رہ گئی ہے۔

(۲) یہ بنک چونکہ بہت ہی سادہ اور پاکیزہ طریق پر عوام سے معاہداتی معاملہ کرے گا۔ اس لیے یہ بآسانی ممکن ہے کہ حکومت سے قانونی طور پر اس کی توثیق کرائی جائے۔ ضرورت ہو تو اسمبلی میں بل پیش کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زکوٰۃ کی جبری وصولی کے لیے ایک دفعہ حکومت کے سامنے سوال اٹھایا گیا تھا تو یہ اس وجہ سے نامنظور ہوا تھا کہ اس سے مسلمانوں کی "متوازی حکومت" قائم ہوتی ہے۔ لیکن ہماری تجویز کے مطابق زکوٰۃ کی جبری وصولی اس معاہدہ کے زیر اثر ہو گی جو بنک اپنے مقروض سے طے کرے گا۔ کوئی حکومت معاہداتی معاملات کی تصدیق سے انکار نہیں کر سکتی۔

(۳) یہ بنک زکوٰۃ اور دوسرے صدقات کی منظم وصولی کا فریضہ بھی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ انفرادی طور پر زکوٰۃ تقسیم کر دینا ایک ناقص طریقہ ہے۔ شریعت اس کا اجتماعی نظم چاہتی ہے لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم پریس اور پلیٹ فارم کو ہماری اس تجویز کی پوری پوری پشت پناہی کرنی چاہیے۔

(۴) اس بنک کا منظور شدہ اور ادا شدہ سرمایہ کم از کم ۵ لاکھ روپے ہو گا۔ جو دس دس روپے کے پچاس ہزار حصص پر مشتمل ہو گا۔ ۵ لاکھ کا سرمایہ مناسب صنعتی کاروبار میں لگا کر کم از کم ۶ فیصدی سالانہ منافع حاصل کیا جا سکے گا۔

بقیہ ایک لاکھ ادنیٰ طبقہ کے مسلمان کاریگروں اور پیشہ وروں کو قرضے دینے کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ اور ابتداءً قلتِ سرمایہ کی وجہ سے قلیل مدت کے لیے قرضے جاری کیے جائیں گے۔

انتظامی مصارف کو تجارتی سرمایہ کے منافع کے ۲۵ فی صدی یعنی چھ ہزار روپیہ سالانہ کے اندر اندر پورا کیا جائے گا۔ اخراجات کا تخمینہ حسب ذیل ہے:

ایک منیجر	۲۰۰ روپیہ ماہوار	۲۴۰۰ سالانہ
ایک اکاؤنٹنٹ	۱۰۰ 〃 〃	۱۲۰۰ 〃
ایک اسٹینوگرافر	۵۰ 〃 〃	۶۰۰ 〃
دو کلرک	۳۰ 〃 〃	۷۲۰ 〃
دو چپراسی	۲۰ 〃 〃	۴۸۰ 〃
متفرق مصارف		۱۲۰ 〃
	میزان	۶۰۰۰ روپے سالانہ

پہلے سال چند ہزار روپے فرنیچر، ٹائپ مشینوں اور آہنی الماریوں وغیرہ پر بھی صرف ہوں گے۔ اس لیے چار لاکھ کے کاروباری سرمایہ پر متوقع چھ فیصدی منافع میں سے دو فیصدی الگ کر کے بھی ہم ۴ فیصدی حصہ داروں میں تقسیم کر سکیں گے اور اگر ان امانتوں کا منافع بھی محسوب کیا جائے گا جو ہمارے بنک کے حوالہ کی جائیں گی تو یقیناً حصہ داروں کو زیادہ منافع ملے گا۔

زکوٰۃ کی رقم کو ٹھیک ٹھیک شرعی مصارف پر صرف کیا جائے گا۔ اور دوسرے صدقات بھی مسلمان عوام کی بہبود کے لیے ڈائرکٹروں کی "شوریٰ" کے مشورے سے خرچ کیے جائیں گے۔ ڈائرکٹروں کی تجویز کے مطابق منافعوں کا ایک مناسب حصہ فلاحِ عامہ کے فنڈ میں بھی شامل ہوتا رہے گا۔ "شوریٰ" صرف ایسے اصحاب پر مشتمل ہوگی جو با اثر ہوں اور مختلف طبقات کے مفاد کی نمائندگی کر سکیں۔

(۵) بنک اس کا مجاز ہوگا کہ میعادی امانتوں (FIXED DEPOSITS) کی جو رقمیں اس کے پاس ہوں انھیں صنعتی تجارتی اور زرعی بیوپاروں میں لگا کر منافع حاصل کرے۔ ایسے منافع میں سے ایک حصہ امانت داروں کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ تاکہ لوگوں میں ہمارے پاس امانتیں رکھوانے کی طرف رغبت پیدا ہو۔

ہمارے بنک کے امتیازات یہ ہوں گے کہ:۔

(ا) اس کی اساس لوٹ کھسوٹ کی خواہش پر نہیں بلکہ خدمت اور تعاون کے جذبہ پر ہوگی اور اس وجہ سے اس کی کشش ہر اس شخص کے لیے ہے جو نفع اندوزی کی جگہ خدمت کرنا چاہے۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔

(ب) یہ بنک ان لوگوں سے بھی زکوٰۃ جمع کرنے کی کوشش کرے گا جو بنک کے مقروض نہ ہوں۔ مگر زکوٰۃ کو اجتماعی نظم کے ساتھ ادا کرنا چاہیں۔

(ج) میعادی امانتوں پر یہ بنک سود نہیں دے گا۔ بلکہ اس کے بجائے ان امانتوں کو کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کرے گا اور اس کا حصّہ امانت داروں کو دے گا۔

جواب:۔

غیر سودی بنک کی یہ تجویز بجائے خود تو بہت مبارک ہے اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کا تجربہ ضرور کیجیے۔ لیکن میری یہ رائے ہے کہ اس کاروبار کو زکوٰۃ و صدقات کے ساتھ خلط ملط کر دینا مناسب نہیں ہے۔ کاروباری ادارہ لازماً کاروباری نوعیت ہی کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت چاہتا ہے۔ اور خیراتی ادارہ بالکل ایک دوسرے طرز کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت کا طالب ہے۔ ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر دینے سے اندیشہ ہے کہ یا تو خیرات کا پہلو نقصان اٹھائے گا یا کاروبار کا پہلو۔ لہٰذا اگر آپ زکوٰۃ و صدقات کی تنظیم چاہتے ہیں تو اس کے لیے الگ انتظام سوچیے اور اس غرض کے لیے ایک مستقل ادارہ بنائیے۔ جہاں تک اس کے انتظامی مصارف کا تعلق ہے اس

کا شریعت نے خود ہی پہلے سے حل کر رکھا ہے۔ زکوٰۃ کی تحصیل اور خرچ کا انتظام کرنے والوں کو شرعاً مال زکوٰۃ سے تنخواہیں لینے کا حق ہے۔

بنک کے کام میں زکوٰۃ و صدقات کی وصولی اور خرچ کو شامل کر دینے سے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ دینے والے بنک میں اپنی زکوٰۃ اس لالچ سے داخل کرائیں گے کہ وہاں سے ان کو قرضے حاصل کرنے میں آسانی ہو اور یہ چیز اس ذہنیت کے بالکل خلاف ہے جس کے تحت ایک مسلمان کو زکوٰۃ دینی چاہیے۔

بنک کے لیے تو مناسب صورت یہی ہے کہ اس کو بالکل کاروباری اغراض کے لیے کاروباری طریقوں پر چلایا جائے۔ مختصراً اس کے اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

(۱) اس کا سرمایہ دو طریقوں پر حاصل ہو۔ ایک شرکائ کے حصص (SHARES) دوسرے ان لوگوں کی امانتیں۔ (DEPOSISTS) جو سود نہیں لینا چاہتے۔

(۲) وہ تین قسم کے کام کرے۔ ایک مختلف صنعتی اور تجارتی کاموں کو سرمایہ فراہم کرنا اور "حصہ داری" کے اصول پر ان کے منافع میں سے اپنا متناسب حصہ وصول کر لینا دوسرے بنک کاری کی وہ ساری جائز خدمات انجام دینا جو آج کل بنک عموماً انجام دیا کرتے ہیں اور ان کی فیس وصول کرنا، تیسرے حاجت مند لوگوں کو قابلِ اطمینان ضمانتوں یا جائدادوں کی کفالتوں پر غیر سودی قرض دینا اور اسی طرح تاجروں کی ہنڈیاں بلا سود بھُنانا اور ان کو کم مدت کے قرضے بلا سود دینا۔

(۳) ان میں سے پہلی دو مدوں سے جو آمدنی حاصل ہو وہ بنک کے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد حصہ داروں اور امانت داروں، دونوں قسم کے لوگوں میں متناسب طریقہ پر تقسیم کر دی جائے۔

(۴) اس بنک میں روپیہ رکھوانے اور اس کے حصص خریدنے کے لیے تین محرک کافی ہیں ایک سود سے بچنے کی خواہش، دوسرے حلال منافع حاصل کرنے کی توقع، تیسرے اپنے مال کے تحفظ کا اطمینان[1] (ترجمان القرآن، شعبان ۶۵ھ، جولائی ۴۶ء)

---

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "سود حصہ دوم" از مصنف

کاروبار میں اسلامی اصولِ اخلاق کا استعمال

سوال:-

ہم نے غلّہ کی ایک دوکان کھول رکھی ہے موجودہ کنٹرول سسٹم کے تحت شہروں میں جمعیت ہائے تاجرانِ غلّہ (FOODGRAINSASSOCIA-TION) قائم ہیں۔ ان جمعیتوں کو حکومت کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ وہ اپنی "فوڈگرین سنڈیکیٹس" بنائیں۔ گورنمنٹ ہر سنڈیکیٹ کو اشیائے خوردنی کے پرمٹ دے گی اور آئندہ غلّہ کا سارا کاروبار صرف سنڈیکیٹ ہی کے معرفت ہوا کرے گا۔ نفع نقصان سب حصہ داروں پر تقسیم ہوجایا کرے گا۔ چنانچہ ہمارے شہر میں ایسی سنڈیکیٹ بن چکی ہے۔ پورے شہر کے غلّہ کا کاروبار کئی لاکھ کا سرمایہ چاہتا ہے اور پورا سرمایہ چونکہ سنڈیکیٹ کے شرکاء فراہم نہیں کرسکتے لہٰذا بنک سے سودی قرض لیں گے اور اس سودی قرض کی غلاظت سے جملہ شرکاء کے ساتھ ہمارا دامن بھی آلودہ ہوگا۔ ہم نے اس سے بچنے کے لیے یہ صورت سوچی ہے کہ ہم اپنے حصّہ کا پورا سرمایہ نقد ادا کردیں اور بنک کے قرض میں حصّہ دار نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر پورے کاروبار کو سنڈیکیٹ سنبھالنے کے قابل نہ ہوئی تو شاید سنڈیکیٹ ایسے سوداگر مقرر کردے جنھیں ایک چوتھائی سرمایہ سنڈیکیٹ دے گی اور بقیہ تین چوتھائی سوداگر اپنی گرہ سے لگائے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ وہ مزدری سرمایہ بنک سے قرض لے، جس کا سود سنڈیکیٹ ادا کرے گی۔ اگر یہ صورت ہوئی تو ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پورے کا پورا سرمایہ اپنی گرہ سے لگائیں گے، اور بنک کے قرض اور سود سے اپنا کاروبار گندہ نہ ہونے دیں گے۔ ہماری ان دونوں تجویزوں کو سنڈیکیٹ نے قبول کرلیا ہے کہ ان میں سے جو شکل بھی ہم چاہیں اختیار کرسکتے ہیں اس معاملہ میں جتنے لوگوں سے ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی اور ہمیں اپنے نصب العین کو ان

پر واضح کرنے کا موقع ملا وہ سب ہمارے اصول کی بہت قدر کر رہے ہیں۔ تمام بیوپاری ہندو ہیں اور بہت حیران ہیں کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ اپنے اصول کی خاطر ہر فائدہ کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ ان پر ہمارے اس رویہ کا اخلاقی اثر اس درجہ گہرا ہوا ہے کہ اب وہ ہر کام میں ہم سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہم پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ ایک تازہ مثال یہ ہے کہ حال میں ایک جگہ سے دس ہزار بوری گندم خریدنے کا فیصلہ ہوا۔ ایک ہندو بیوپاری کو خریداری کے لیے مقرر کیا گیا۔ مگر ایسوسی ایشن کا اصرار تھا کہ اس کے ساتھ ہم میں سے بھی کوئی جائے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمیں کاروبار کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے، مگر ان کی ضد قائم رہی آخر راقم الحروف کا جانا طے ہوگیا۔ بعد میں جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو ان میں سے ایک شخص نے صاف کہا کہ اور جو کوئی بھی جائے گا کسی نہ کسی قسم کی بے ایمانی کرے گا مگر آپ لوگوں میں سے جو گیا وہ نہ خود بے ایمانی کرے گا نہ دوسرے کو کرنے دے گا۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل امور کے متعلق آپ کی ہدایت درکار ہے:۔

(۱) سردست تو ہمارا اور ان غیر مسلم تاجروں کا ساتھ نبھ رہا ہے لیکن آگے چل کر یہ ساتھ نہ نبھ سکا تو پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنی ایک الگ "مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن" بنالیں اور خدا کی نافرمانی سے ہر ممکن حد تک بچ کر اپنا کاروبار چلائیں؟

(۲) ہندو مسلم مخاصمت کی وجہ سے یہاں کی فضا حد درجہ خراب ہے اور چونکہ مارکیٹ پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ضروریات زندگی حاصل کرنے میں تکلیف پیش آرہی ہے، ان حالات میں ایک مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے حصّہ کا پورا کوٹہ اسی کو ملے۔ ہمیں بعض اصحاب مشورے دے رہے ہیں کہ تم بھی اس میں شامل ہو جاؤ۔ مگر ہمیں اس کے اندر قوم پرستانہ کشمکش کی بو محسوس

ہوتی ہے اور اسی بنا پر ہم اس سے پرہیز کر رہے ہیں کیا یہ رویہ ہمارے لیے مناسب ہے؟

(۳) بعض ہندو حضرات جو ہمارے اصول و اخلاق کے قدرداں ہیں ہمیں اخلاص یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر بنک سے آپ لوگ معاملہ نہ کریں گے تو سنڈیکیٹ کے ساتھ آپ کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بلکہ علیحدہ ہو کر بھی آپ کاروبار نہ چلا سکیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسی صورت پیش آجائے تو ہم کیا کریں؟ کیا اضطراراً بنک سے معاملہ کریں؟

(۴) پنجاب انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے فیکٹری لگانے والوں کو سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔ اس وجہ سے گورنمنٹ انڈسٹری کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ ہمارے یہاں کھڈیوں کا کارخانہ بھی ہے، ایک دوست کا مشورہ ہے کہ ہم بھی حکومت سے گرانٹ کی درخواست کریں۔ مگر ہمیں شک ہے کہ ارکانِ جماعت ہوتے ہوئے ہم ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:۔

آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی شرکت میں سود سے بچنے کا جو اہتمام کیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیئے۔ اگرچہ اس میں بہت سے نقصانات کے اندیشے آپ کے سامنے آئیں گے اور بہت سے فائدے بھی ہاتھ سے جاتے محسوس ہوں گے مگر مآل کار میں اس کے اتنے فائدے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہ صرف آپ کی عاقبت درست ہوگی بلکہ انشاء اللہ بہت سے دوسرے بندگانِ خدا کو بھی ہدایت نصیب ہوگی۔ آپ نے خود ہی چند روز کے تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ اگر مسلمان ٹھیک ٹھیک اسلامی اصولوں پر کام کرے تو اس کا کیسا زبردست اخلاقی اثر اس کے پورے ماحول پر چھا جاتا ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے جوابات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اگر کبھی غیر مسلم شرکاء سے آپ کا ساتھ نہ نبھ سکے اور آپ کو اپنی الگ تجارتی

جمعیت بنانی پڑے تو اس کا نام "مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن" رکھنے کے بجائے ؟
DEALERS ASSOCIATION) یا اسی طرح کا کوئی دوسرا اردو یا انگریزی نام رکھیے اور اس میں شرکت کے لیے انصاف و دیانت کے چند ایسے اصول مقرر کیجیے جن کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ یہی انصاف ہے اور اسی کا نام ایمانداری ہے۔ مثلاً یہ کہ سود نہ لیں گے نہ دیں گے، سٹہ نہ کریں گے۔ ایک مقرر فی صدی سے زیادہ منافع نہ لیں گے۔ جعلی کھاتے نہ رکھیں گے۔ جھوٹ نہ بولیں گے۔ خریدار کو مال کا حسن و قبح ٹھیک ٹھیک بتا دیں گے۔ ناپ تول میں کمی نہ کریں گے۔ پھر اس کا دروازہ، ہندو، مسلمان، سکھ سب کے لیے کھلا رکھیے اور اعلان کر دیجئے کہ ان شرائط پر جو شخص بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہے، ہو سکتا ہے۔

(۲) ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی کشمکش سے اپنے آپ کو قطعاً بالاتر رکھیے اگر کبھی غیر مسلموں سے آپ کو تجارتی شرکت توڑنی پڑے بھی تو اسے قومی جھگڑے کی بنا پر نہ توڑیے بلکہ اصول کی لڑائی لڑ کر توڑیے۔ اور ان سے الگ ہو کر جو تجارتی جمعیت آپ بنائیں اسے بھی کسی ایک قوم کے تاجروں تک محدود نہ رکھیے۔ بلکہ چند معروف اصولوں پر قائم کر کے صلائے عام دیجئے کہ جو ان اصولوں کو قائم کرے وہ ہمارے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔ آپ کی تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہر قوم کے لوگوں کے ساتھ آپ کا زیادہ سے زیادہ سابقہ اور معاملہ پیش آئے تاکہ آپ اپنی اصولی دعوت کو اور اپنے اخلاقی اثرات کو ہر طرف بے روک ٹوک پھیلا سکیں۔ قوم پرستانہ کشاکش میں اپنا دامن آپ نے الجھا لیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا آپ نے چار دروازوں میں سے تین دروازے اپنے اوپر خود بند کر لیے۔

(۳) اگر کسی وقت آپ دیکھیں کہ سودی معاملات کیے بغیر بڑے پیمانہ پر تجارت نہیں کی جا سکتی تو بجائے اس کے کہ آپ اضطرار کے بہانے سودی معاملات کریں بڑے پیمانے کی تجارت چھوڑ دیجئے اور صرف اس تھوڑی سی بقدر کفاف آمدنی پر قناعت کیجئے جو اللہ حلال ذرائع سے آپ کو دے۔ آپ کا یہ سوال کہ کیا ہم اضطراراً بنک سے معاملہ کر لیں؟ بڑا ہی عجیب سوال ہے۔ کیا واقعی بہت کمانے کے لیے بھی آدمی کبھی مجبور و مضطر ہو سکتا ہے؟ کوئی بھوکا مر رہا ہے بے شک وہ کہہ سکتا ہے کہ میں حرام کے

چند ٹکے حاصل کرنے پر مجبور ہوں۔ مگر کھاتا پیتا آدمی کہے کہ میں حرام کے ہزاروں روپے کمانے پر مجبور ہوں تو یہ بالکل ایک نرالی قسم کی مجبوری ہوگی۔ ایسے حیلوں سے حرام کو اپنے لیے حلال کرنے کا تصور بھی آپ کے ذہن میں کبھی نہ آنا چاہیے پھر ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ اپنے اصولوں کی اس قدر شوراشوری کے بعد اگر آخر کار آپ نے یہ بے نگی دکھائی کہ ذرا سے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچتے دیکھ کر بنک کے دروازے پر توبہ توڑ بیٹھے تو آج تک آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سب پر کس بری طرح پانی پھر جائے گا۔ یہ حرکت کرکے تو گویا آپ خود ہی یہ ثابت کردیں گے کہ اسلام کے اصول صرف بیان کرنے کے لیے ہیں برتنے کے لیے نہیں ہیں۔ جو ہندو دوست آپ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں اُن کو جواب دیجئے کہ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ مگر بجائے اس کے کہ ہم آپ کا مشورہ قبول کرکے اپنے اصولوں کے خلاف سودی کاروبار میں مبتلا ہوں، ہم آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر ایک مرتبہ آپ غیر سودی اصولوں پر لین دین کرنے کا تجربہ کر دیکھیں اس تجربے سے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیز ہمارے اور آپ کے اور سب کے لیے سودی کاروبار سے بہتر ہے۔ اگر آپ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم ایک غیر سودی بنک قائم کرکے اور کامیابی کے ساتھ اس کو چلا کر عملاً اس کا فائدہ آپ کو دکھا سکتے ہیں۔

(۴) حکومت سے گرانٹ کی درخواست آپ رکن جماعت ہوتے ہوئے نہیں کرسکتے۔ البتہ اگر حکومت آپ سے یہ درخواست کرے کہ آپ اس کی گرانٹ قبول کریں اور اس بات کا اطمینان دلائے کہ وہ یہ گرانٹ محض ملکی صنعت کی ترقی کے لیے دینا چاہتی ہے، آپ کا ضمیر خریدنا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے تو اس درخواست پر ہمدردانہ غور کیا جاسکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، شعبان ۶۵ھ، جولائی ۴۶ء)

چند کاروباری مسائل

سرکاری نرخ پر خرید کر چور بازار میں بیچنا

سوال:-

ایک تاجر اپنے کاروبار میں پوری طرح راست باز اور دیانتدار ہے اور احکامِ شریعت کی پابندی کرتا ہے سامانِ تجارت اسے کنٹرول ریٹ پر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بازار میں چور بازاری کی وجہ سے بعض اشیاء کی قیمتیں بہت چڑھی ہوئی ہیں۔ اس صورت میں کیا وہ مروجہ نرخ پر اپنا مال فروخت کرنے کا حق رکھتا ہے۔

جواب:-

کنٹرول ریٹ سے خریدا ہوا مال کنٹرول ریٹ پر ہی بیچنا چاہیے۔ کنٹرول ریٹ پر خرید کر بلیک مارکیٹ میں مال فروخت کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کے اندر نفع اندوزی کی حرص کے سوا اور کوئی شریفانہ جذبہ باقی نہیں رہا۔ البتہ اضطراراً وہ چھوٹے تاجر ایک حد تک بلیک مارکیٹنگ کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔ جنھیں مال تجارت ملتا ہی بلیک مارکیٹ سے ہو اور کنٹرول ریٹ پر حاصل ہونا ناممکن ہو جائے نیز انھیں کوئی دوسرا مشغلہ یا پیشہ اختیار کرنے کی بھی استطاعت نہ ہو۔

نقد کی قیمت اور ادھار کی اور

سوال:-

اگر کوئی دکاندار اس اصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیاء کی کم قیمت لے اور ادھار لینے والے سے زیادہ تو کیا وہ سود خواری کا مرتکب ہو گا؟ ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فروخت

پر کچھ معمولی سا کمیشن رکھا جاتا ہے، مثلاً ایک پیسہ فی روپیہ اور یہ صرف نقد خریداری کی صورت میں گاہک کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟

ـ

ت تو صریحاً سود کی ہے، (۲) دوسری شکل تو اگرچہ اصطلاحاً یہ سود کی تعریف

میں نہیں ... ہی کی موجود ہے۔ فقہ کی زبان میں یہ ربوٰا"

نہیں ہے۔ مگر "ربیہ" سے ... ب پرہیز کے لائق چیز ہے۔ دعوا الربوا

والریبۃ (الحدیث)

محصول سے بچنے کی کوشش

سوال:-

ہمارے شہر میں اور عام طور پر ملک بھر میں ارباب تجارت کا طریق کار یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو چنگی سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اول تو چوری چھپے مال دوکان پر پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ نہ ہو سکے تو محرر چنگی کو کچھ دے دلا کر کام چلاتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم مال ظاہر کرنے والے نقلی بیجک بنا کر اس کے مطابق اندراجات کم چنگی ادا کرتے ہیں اور دوکان کے رجسٹروں میں اسی نقلی بیجک کے مطابق اندراجات کرتے ہیں۔ وہ مال رجسٹروں میں دکھایا ہی نہیں جاتا جس پر چنگی ادا نہ کی گئی ہو، اس طرح مال کی آمد، بکری اور منافع سبھی واقعی سے کم دکھائے جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقے جائز ہیں؟

جواب:-

معاملہ کی اس پوری شکل کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ موجودہ نظام حکومت کے عائد کیے ہوئے ٹیکس بجائے خود ناجائز ہیں اور ناروا اغراض

کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس استحصال ناجائز سے بچنے کے لیے جھوٹ اور جعل و فریب اور رشوت کے ہتھیار استعمال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اس طرح اپنے مال کو تو بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن متاع اخلاق برباد ہو جائے گی اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگوں کے اندر وہ اخلاقی حس ہی مفقود ہونی شروع ہو جائے گی جو انسان کو اپنے معاملات میں صداقت و دیانت سے کام لینے پر آمادہ کرتی ہے۔

رشوت دینے کی مجبوری

سوال:۔

ریلوے اسٹیشنوں سے جب مال کی بلٹیاں چھڑوانے جاتے ہیں تو ریلوے کے کلرک رشوت کا مطالبہ کرتے ہیں جسے اگر رد کیا جائے تو طرح طرح سے نقصان اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایک مومن تاجر کیا کرے؟

جواب:۔

عجیب معاملہ ہے کہ یہ لوگ جب حکومت سے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس بڑھوانے کے لیے ہڑتالیں کرتے ہیں تو پبلک کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب ادھر سے اپنا کام نکال لیتے ہیں تو اسی پبلک کو طرح طرح سے پریشان کر کے اس کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ درحقیقت یہ نہایت ضروری ہے کہ ان لوگوں کو صاف صاف متنبہ کر دیا جائے کہ اگر تم پبلک کے ساتھ ایماندارانہ رویّہ اختیار نہ کرو گے تو اپنے مطالبات میں پبلک سے کسی ہمدردی کی توقع نہ رکھو۔

رہا نفس سوال تو اس کے متعلق پہلے بھی میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ حکومت کے ملازموں سے ناروا فائدے اٹھانے کے لیے ان کو رشوت دینا قطعی حرام ہے لیکن اگر اپنے جائز حقوق بھی آپ ان کو رشوت دیے بغیر نہ حاصل کر سکیں اور ان کا نقصان بھی

آپ کے لیے قابلِ برداشت نہ ہو۔ نیز اس قسم کے رشوت خور ملازموں کی شکایت ان کے افسروں سے کرنے کا بھی موقع نہ ہو یا اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو تو مجبوراً ان کو رشوت دیجئے اور ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے رہیے کہ یہ حرام خوری ہے جو تم کر رہے ہو اور تمہارا اپنا بھلا اسی میں ہے کہ اس سے بچو۔

آڑھت کے بعض ناجائز طریقے

سوال:۔

آڑھت کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ آڑھتی کے پاس دو قسم کے بیوپاری آتے ہیں۔ پہلی قسم کے بیوپاری اپنے سرمایہ سے کوئی جنس خرید کر لاتے ہیں اور آڑھتی کی وساطت سے فروخت کرتے ہیں دوسری قسم کے بیوپاری وہ ہوتے ہیں جو کچھ معمولی سا سرمایہ اپنا لگاتے ہیں اور بقیہ آڑھتی سے اس شرط پر قرض لیتے ہیں کہ اپنا خریدا ہوا مال اسی آڑھتی کے ہاتھ فروخت کریں گے اور بوقت فروخت مال آڑھتی کا روپیہ بھی ادا کر دیں گے۔ آڑھتی پہلی قسم کے بیوپاریوں سے اگر ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا ہے تو اس دوسری قسم کے بیوپاریوں سے دو پیسہ فی روپیہ لے گا۔ یہ صورت حرام ہے یا جائز؟

جواب:۔

یہ فرق جو آڑھتی اپنے کمیشن میں رکھتا ہے غلط ہے، قرض لینے والے سے دو پیسہ اور قرض نہ لینے والے سے ایک پیسہ فی روپیہ آڑھت لینا تو سود کی تعریف میں آجاتا ہے۔ چاہئے یہ کہ قرض کا معاملہ الگ رہے اور مال کی فروخت کے لیے ایجنٹ کی حیثیت سے کمیشن لینا بالکل الگ رہے۔ البتہ یہ پابندی جائز ہو سکتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ پر بیوپاری اپنا مال خاص اسی آڑھتی کے ہاتھ لا کر فروخت کیا کرے جس کے روپے سے وہ کاروبار چلا رہا ہے۔

سوال:۔

آڑھتی بائع اور خریدار سے کمیشن لینے کے علاوہ ایک حرکت یہ بھی کرتا ہے کہ مال کا سودا ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ مقدار "چونگی" کے نام سے لے لیتا ہے مثلاً پھل ہوں تو اس میں سے چند دانے لے لیگا۔ اور سبزی ہو تو اس میں سے اپنا حصّہ لگائے گا۔ اس چونگی کی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۔

یہ چنگی لینا آڑھتی کی زیادتی ہے وہ جب اپنا طے شدہ کمیشن لے چکا تو اب اسے اور کچھ لینے کا حق نہیں حقیقت میں یہ "دست درازی" ہے جس کا ایک معصوم نام "چنگی" رکھ لیا گیا ہے۔

زمین داری کے مکروہات

سوال:۔

میں جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر کافی متاثر ہوں۔ ذہن کا سانچہ بدل چکا ہے اور یہ سانچہ موجودہ ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگار نہیں ہو رہا۔ مثلاً ایک اہم الجھن کو لیجئے۔ ہمارا آبائی پیشہ زمین داری ہے۔ اور والد صاحب نے مجھے اسی پر مامور کر دیا ہے۔ زمین داری کا عدالت اور پولیس وغیرہ سے چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ عدالت اور پولیس سے بے تعلقی کا اظہار زمیندار کی کامل معاشی موت ہے۔ حد یہ کہ عدالت اور پولیس کی پشت پناہی سے بے نیاز ہوتے ہی خود اپنے ملازمین اور مزارعین پر زمین دار کا کوئی اثر نہیں رہ جاتا۔ خود پولیس جب یہ دیکھتی ہے کہ کوئی زمین دار اس کی بالائی آمدنی میں حائل ہو رہا ہے تو وہ اسی کے مزارعین اور ملازمین کو اکسا کر اس کے مقابلہ پر لاتی ہے۔ اسی طرح عدالت کا ہوا جہاں کارندوں کے سامنے سے

ہٹا پھر ان کو ضمیر کی آواز کے سوا کوئی چیز فرائض پر متوجہ نہیں رکھ سکتی اور حال یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے مادی فائدہ سے بڑھ کر کسی شے میں اپیل نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ایک مثال کافی ہوگی۔ ہمارے یہاں دستور تھا کہ کارندوں کے کام میں نقص رہے یا وہ کسی قسم کا نقصان کر دیں تو ان سے تاوان وصول کیا جاتا تھا۔ ہم نے یہ تاوان وصول کرنا بند کر دیا۔ کیونکہ پولیس کی مدد کے بغیر یہ سلسلہ چل نہیں سکتا۔ رویّہ کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی کاشتکاروں نے نقصان کرنا شروع کر دیا اور کارندوں نے بھی جرمانہ کی رقم میں سے جو حصہ ملتا تھا اس سے مایوس ہو کر چشم پوشی اختیار کی اب حالات اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ میں زمینداری کو سرے سے ختم کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں آپ کی رائے میں چارۂ کار کیا ہے؟

جواب:۔

زمینداری میں پولیس اور عدالت سے تعلق رکھنے کی جو ضرورت اس کافرانہ نظام میں پیدا ہوگئی ہے اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ قانون کی حدود سے بے نیاز ہو کر ایک زمیندار کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو دعوتِ اسلامی کا کام کرنا ہو اسے اپنے جملہ معاملات قانون کے سہارے کے بجائے اخلاقی بنیادوں پر قائم کرنے چاہئیں اور اس سلسلہ میں جو نقصانات بھی پہونچیں انھیں برداشت کرنا چاہیے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ آیا آپ دعوت اسلامی کا کام کریں یا قانون کے سہارے زمینداری چلائیں۔ بہر حال یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں نبھ سکتے۔ جن لوگوں پر آپ پولیس اور عدالت کے ذریعہ سے اپنی زمینداری کا زور چلائیں گے۔ وہ آپ کے اخلاقی اثر سے کبھی متاثر نہیں ہو سکتے اور نہ آپ کی اس دعوت میں کوئی صداقت محسوس کر سکتے ہیں کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور قانون صرف خدا کا چلنا چاہیے۔

گڑیوں کا حکم

سوال:۔

کیا بچوں کے کھیل کا سامان مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، ربڑ کی چڑیاں اور لڑکیوں کے لیے گڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے۔ نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی کیا بیچی جا سکتی ہیں؟

جواب:۔

بچوں کے کھلونے بیچنا بجائے خود ناجائز نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسّمے تو ان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خد و خال کے ساتھ انھیں بنایا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری سا ڈھانچہ کسی جاندار کا ہو۔ جیسے لکڑی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسموں کی فروخت جائز نہیں ہے البتہ دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ رہیں ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں تو اگر وہ مشرکانہ تخیلات کی نمائندہ ہوں مثلاً کرشن جی کی مورتی یا رام چندر جی کا مجسمہ وغیرہ تو ان کی فروخت حرام ہے۔

اشتہاری تصویریں

سوال:۔

اشتہار کے لیے کیلنڈروں وغیرہ پر آج کل عورتوں کی تصاویر بنانے کا بہت رواج ہے۔ نیز بعض مشہور شخصیتوں اور قومی ہیروؤں کی تصاویر بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں تجارتی اشیاء کے ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر بھی تصاویر چھاپی جاتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں سے ایک مسلمان تاجر اپنا دامن کیسے بچا سکتا ہے؟

جواب:۔

اگر کوئی اشتہار یا کیلنڈر خود آپ چھپوائیں تو اسے تصویر سے پاک رکھیں اور ضرورتاً اگر آپ کو اپنی ذات کے لیے کیلنڈروں وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے تو اول تو بے تصویر لیجئے ورنہ تصاویر کو چھپا دیجئے یا مسخ کر دیجئے۔ لیکن ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر آپ کہاں تک تصاویر کو مٹا سکتے ہیں۔ موجودہ تصویر پرست دنیا نے قسم کھالی ہے کہ کسی چیز کو تصویر سے خالی نہ چھوڑے گی۔ ڈاک کے ٹکٹوں اور سکوں تک پر تصاویر موجود ہیں۔ یہ ہمہ گیر نظامِ طاغوت اپنی ناپاکیوں اور غلاظتوں کو جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ بس اپنی حدِ امکان تک اپنا دامن بچائیے اور اس حد سے آگے جو کچھ ہے اس سے اپنے آپ کو اور دنیا کو بچانے کے لیے یہ سعی کیجئے کہ نظامِ باطل کا تسلّط ختم ہو اور نظامِ حق کا اقتدار جمے، اس کی جڑ کٹے گی تو شاخیں آپ ہی جھڑ جائیں گی۔

"سیپ" اور "دلالی"

سوال:۔

ہر گاؤں میں عموماً ایک لوہار اور ایک بڑھئی ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے زمیندار کام لیتے ہیں اور معاوضہ نقد نہیں ادا کرتے نہ تنخواہ دیتے ہیں۔ بلکہ فصل کے فصل ایک مقررہ مقدار غلّہ کی انھیں دے دی جاتی ہے اس صورتِ معاملہ کو سیپ کہا جاتا ہے۔ زمیندار لوگ جب کبھی لوہے یا لکڑی کا سامان خریدنا چاہتے ہیں تو اپنے لوہار یا بڑھئی کو اپنے ساتھ شہر لے جاتے ہیں تاکہ وہ اچھا مال خرید وا دے۔ یہ لوہار یا بڑھئی بعض کارخانوں اور دکانوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور وہاں سے سامان خرید واتے ہیں اور ہوتا یوں ہے کہ یہ لوگ دکان پر جاتے ہی آنکھوں کے اشاروں سے دلالی کی فیس دکاندار سے طے کر لیتے ہیں جس سے زمیندار بے خبر رہتا ہے۔ اگر دوکاندار لوہار

یا بڑھئی کی دلالی کا کمیشن ادا نہ کرے تو پھر وہ کبھی بھی اپنے زمینداروں کو اس کی دکان پر نہ لائے گا۔ بلکہ کسی دوسری جگہ ساز باز کرے گا اور جو دوکاندار ان کا کمیشن دینے پر راضی ہو وہ خراب مال بھی اگر دکھائے تو یہ خاص قسم کے دلال اس کی تعریف کریں گے اور اسے بکوانے کی کوشش کریں گے۔ یہ سازش اگر زمیندار پر آشکارا ہو جائے تو وہ اپنے بڑھئی یا لوہار کو ایک دن بھی گاؤں میں نہ رہنے دے۔ یہ صورتِ معاملہ کیسی ہے؟

جواب:-

"سیپ" معاملہ کی ایسی شکل ہے جو دیہاتی زندگی میں "معروف" کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اس لیے اسے ناجائز نہیں کہا جاسکتا البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں بے گار کا عنصر شامل نہ ہونے پائے۔ یعنی فی الواقع جن لوگوں سے جتنی خدمت لی جائے ان کو اس کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔ مقررہ خدمات سے زائد کوئی کام لینا ہو تو اس کا حق الگ اسے دینا چاہیے۔ محض زمینداری کی دھونس میں لوگوں سے بے جا خدمت لینا ظلم ہے۔

دلالی کی جو شکل آپ نے لکھی ہے اس کے ناجائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دراصل زمینداروں کی زیادتی کا نتیجہ ہے پیشہ ور لوگ محض ان کے دباؤ سے مجبوراً اپنے کام کاج کا ہرج کر کے ان کے ساتھ مال خریدوانے جاتے ہیں اور اس کا معاوضہ دوکانداروں سے گویا اس قرارداد پر وصول کرتے ہیں کہ اگر تم ہمیں کمیشن دیتے رہو گے تو ہم تمہارا برا مال بھی ان زمینداروں کے ہاتھ بکوادیں گے۔ اس طرح یہ مال فروخت کرانے والا، اور دوکاندار اور ان کے ساتھ زمیندار بھی تینوں ایک ایک قسم کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر زمیندار ان لوگوں سے مفت کی خدمت لینا چھوڑ دیں۔ اور انصاف کے ساتھ ان کا حق المحنت انھیں دیا کریں۔ تو یہ بداخلاقی رونما نہ ہو۔

تجارت میں "عرف" کی حیثیت

سوال:۔

چمڑے کے کاروبار میں کروم ایک ایسی چیز ہے جس پر فٹ کی پیمائش کا اندراج بہت غلط ہوتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کلکتہ میں تیار ہوتا ہے۔ مال تیار کرنے والے ہر تھان پر اصل پیمائش سے زائد فٹ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً دس فٹ کے تھان کو بارہ فٹ ظاہر کرتے ہیں اس کے بعد کلکتہ کے تاجر مال خریدتے ہیں اور یہ کچھ اور فٹ بڑھا دیتے ہیں اس کے بعد جب باہر کے تاجران سے مال خرید لے جاتے ہیں تو پھر وہ مزید فٹ بڑھاتے ہیں۔ یہاں آکر تھان پر فٹوں کا پکا اندراج ہو جاتا ہے اور پھر آخر تک یہی اندراج قائم رہتا ہے۔ صحیح فٹ والا مال مارکیٹ میں نہیں ملتا۔ تقریباً سبھی کارخانے اور تاجر یہی کچا فٹ استعمال کرتے ہیں عام طور پر گاہک اس صورت حال سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہم پیمائش کی اس گڑبڑ کے متعلق کوئی توضیح نہیں کرتے لیکن اگر کوئی گاہک پوچھے تو اسے صاف بتا دیتے ہیں کہ اس مال پر کچے (یعنی غلط) فٹوں کا نمبر لگا ہوا ہے۔ ہم اسی کچے فٹ کے حساب سے خریدتے ہیں اور اسی کے حساب سے منافع لگا کر فروخت کرتے ہیں مثلاً ایک کچا فٹ اگر ۱۲ر میں آتا ہے تو ہم ایک کچے فٹ کے ۱۲ار لگائیں گے۔ شرعاً ایسے کاروبار کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:۔

تجارت میں جب یہ چیز معروف ہے یعنی دوکاندار اور خریدار سب اس بات سے واقف ہیں کہ کچے اور پکے اوزان اور پیمانوں میں کیا فرق ہے اور کون سی چیز پکے پیمانوں کے حساب سے ملتی ہے اور کون سی کچے پیمانوں کے حساب سے تو اس صورت میں یہ معاملہ جائز شمار ہوگا۔ لیکن یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ گونا گوں اوزان اور پیمانے رائج رہیں اس سے ناواقف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ایک اچھے نظام حکومت کا فرض ہے کہ وہ تجارت کو ان "اسرار نہاں" سے پاک کرے۔

(ترجمان القرآن [illegible])

سیاسی مسائل

اسلامی ریاست میں ذمّی رعایا

سوال:-

میں ہندو مہا سبھا کا ورکر ہوں۔ سال گزشتہ صوبہ ...... کی ہندو سبھا کا پروپگنڈہ سکریٹری منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی میں جناب کے نام سے شناسا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل وسوئم، اسلام کا نظریۂ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، سلامتی کا راستہ، وغیرہ دیکھی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطعًا بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہوگئی ہوتی تو ہندو مسلم مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومت الٰہیہ کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس میں زندگی بسر کرنا قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ مگر چند امور دریافت طلب ہیں۔ خط و کتابت کے علاوہ ضرورت ہوگی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومتِ الٰہیہ کے اندر کس درجہ میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہل کتاب کے حقوق دیے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہلِ کتاب اور ذمّی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر عربی حملہ کی تاریخ کا علم ہے محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کے ہندوؤں کو اہل کتاب کے حقوق دیے تھے۔ امید ہے کہ آپ اس معاملہ میں تفصیلی طور پر اظہارِ خیال کریں گے۔

نیز یہ بھی فرمایئے کہ اہلِ کتاب اور ذمّی کے حقوق میں کیا فرق ہے کیا

وہ ملک کے نظم ونسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار رہوں گے جو کہ آپ حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ قرآن کے فوجداری اور دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا ہندوؤں کا قومی قانون (PERSONAL LAW) ہندوؤں پر نافذ ہوگا یا نہیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ ہندو اپنے قانونِ وراثت مشترکہ فیملی سسٹم اور متبنیٰ وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منوشاستر) کے مطابق زندگی بسر کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محض ایک متلاشیٔ حق کی حیثیت سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جواب:۔

میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر کیے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ کو پیچیدہ اور ناقابلِ حل حد تک پیچیدہ بنا دینے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اصولِ حق اور راستی کی بنیادوں پر مسائلِ زندگی کو حل کرنے کے بجائے شخصی خاندانی طبقاتی، نسلی اور قومی بنیادوں پر انھیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اور اس بدقسمتی میں ہم آپ سب برابر کے شریک ہیں۔ کوئی بھی فائدے میں نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اگر حکومتِ الٰہیہ قائم ہو تو اس کی حیثیت یہ نہ ہوگی کہ ایک قوم دوسری قوم یا اقوام پر حکمراں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت یہ ہوگی کہ ملک پر ایک اصول کی حکومت قائم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری باشندگانِ ملک میں سے

وہی لوگ اٹھا سکیں گے جو اس اصول کو مانتے ہوں۔ دوسرے جو لوگ اس اصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر "اہلِ ذمّہ" کی حیثیت حاصل ہوگی یعنی جن کی حفاظت کی ذمّہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲۔ "اہل کتاب" اور "عام اہل ذمّہ" کے درمیان اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ ذمیّوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا، البتہ اصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذمی دو طرح کے ہو سکتے ہیں ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمّہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدہ کے ذمّہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیّوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدہ میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذمّی، تو ان کا ذمّی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے ذمّہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان و مال اور آبرو کی، ان کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے ان کے خون کی قیمت وہی ہوگی جو مسلمانوں کے خون کی ہے ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم بہ جبر ان پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔

ذمیوں کے متعلق اسلام کے دستوری قانون کی تفصیلات ان شاء اللہ ہم ایک کتاب کی شکل میں الگ شائع کریں[1] گے۔

۴۔ جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لا، کا تعلق ہے وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک

---

[1] اس موضوع پر جماعتِ اسلامی کی طرف سے دو مستقل رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

لازمی جزء ہے اس لیے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح وطلاق اور قوانین وراثت وتبنیت کو اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (LAW OF THE LAND) سے نہ ٹکراتے ہوں۔ ان پر جاری کرے گی اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لا، کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا بُرا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تو ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے یا مثلاً اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (PROST-ITUTION) کا کاروبار جاری رکھ سکے کیونکہ یہ اخلاقِ انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (CRIMINAL LAW) سے بھی ٹکراتی ہے جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون بھی ہوگا اسی پر آپ دوسرے امور کو قیاس کر سکتے ہیں۔

۵۔ آپ کا یہ سوال کہ آیا ذمی ملک کے نظم ونسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومتِ الٰہیہ میں دیں گے؟ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اصولی غیر قومی حکومت (IDEOLOGICAL NON NATIONAL STATE) کی حیثیت آپ نے اس میں ملحوظ نہیں رکھی ہے دوسرے یہ کہ کاروباری لین دین کی ذہنیت اس میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اول میں تصریح کر چکا ہوں۔ اصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اس اصول پر یقین رکھتے ہوں، وہی اس کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ انہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین وایمان سمجھتے ہوئے اس ریاست کے کام کو چلائیں گے۔ اور انہی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لیے اگر ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں قربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اصول پر ایمان

نہیں رکھتے اگر حکومت میں شریک کیے بھی جائیں گے تو نہ وہ اس کی اصولی اور اخلاقی روح کے مطابق کام کرسکیں گے اور نہ ان کے اندر ان اصولوں کے لیے اخلاص ہوگا جن پر اس حکومت کی عمارت قائم ہوگی۔ سول محکموں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر ملازمانہ ذہنیت کارفرما ہوگی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور قابلیتیں بیچیں گے اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرائے کے سپاہیوں (MERCENARIES) جیسی ہوگی اور وہ ان اخلاقی مطالبات کو پورا نہ کرسکیں گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے۔ اس لیے اصولاً اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہل ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے برعکس فوجی حفاظت کا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہل ذمہ سے صرف ایک دفاعی ٹیکس لینے پر اکتفا کرتی ہے لیکن یہ ٹیکس اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہلِ ذمہ سے نہیں لیے جا سکتے۔ اگر اہل ذمہ بطور خود فوجی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں تو وہ ان سے قبول کرلی جائے گی اور اس صورت میں دفاعی ٹیکس ان سے نہ لیا جائے گا۔ رہے سول محکمے تو ان سے کلیدی مناصب (KEY POSITIONS) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین وتحفظ سے تعلق رکھتے ہیں بہر حال اہل ذمہ کو نہیں دیے جا سکتے۔ البتہ کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اسی طرح جو اسمبلی شوریٰ کے لیے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہلِ ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کونسلیں بنادی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی دیکھ بھال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی نظم ونسق کے متعلق اپنی خواہشات، اپنی ضروریات اور شکایات اور اپنی تجاویز کا بھی اظہار کرسکیں گی جن کا پورا پورا لحاظ اسلامی مجلسِ شوریٰ (ASSE-MBLY) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے، جو بھی اس کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے خواہ وہ ہندو زادہ ہو، یا سکھ زادہ لیکن جو اس کے اصول کو تسلیم نہ کرے وہ خواہ مسلم زادہ

ہی کیوں نہ ہو حکومت کی محافظت (PROTECTION) سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ "کیا تم ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرو گے جو حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو دو گے ؟" دراصل مسلم لیگ کے لیڈروں سے کیا جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہی دین کی باتیں وہی کر سکتے ہیں۔ ہم سے آپ پوچھیں گے تو ہم تو اس کا بے لاگ اصولی جواب دیں گے۔

جہاں تک حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اصولاً دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں۔

یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو یا پھر ایسی حکومت جو وطنی قومیت کی بنیاد پر ہو۔

پہلی صورت میں آپ کے لیے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے حقوق حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو ملیں گے ویسے ہی حقوق ہم "رام راج" میں مسلمانوں کو دیں گے بلکہ آپ کو اس معاملہ میں کوئی رہنمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم و کاست اسی پر عمل کریں قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملہ سے بہتر ہو گا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پائیں گے اور بعید نہیں کہ ایک روز ہماری حکومتِ الٰہیہ آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو ظاہر ہے کہ دیر یا سویر نتیجہ بھی برعکس نکل کر ہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت وطنی قومیت کی بنیاد پر قائم ہو تو اس صورت میں بھی آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جمہوری (DEMOCRATIC) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں۔ یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (SUBJECT-NATION) کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔

ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں

بہر حال آپ کے برتاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست ان اصولوں میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمیوں سے معاملہ کرنے کے لیے قرآن و حدیث میں مقرر کر دیے گئے ہیں آپ چاہیں تو اپنی قومی ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام کر دیں اور ایک مسلمان بچے تک کو زندہ نہ چھوڑیں اسلامی ریاست میں اس کا انتقام لینے کے لیے کسی ذمّی کا بال بیکا تک نہ کیا جائے گا اس کے برعکس آپ کا جی چاہے تو ہندو ریاست میں صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف سب ہی کچھ مسلمان باشندوں کو بنا دیں۔ بہر حال اس کے جواب میں کوئی ایک ذمی بھی کسی ایسی پوزیشن پر مقرر نہیں کیا جائے گا جو اسلامی ریاست کی پالیسی کی شکل اور سمت معین کرنے میں دخل رکھتی ہو۔

(ترجمان القرآن، رجب، شوال ۶۳ھ جولائی اکتوبر ۴۴ء)

مزید تصریحات

سوال :۔

آپ کی جملہ تصانیف اور سابق عنایت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عہد میں ذمّی اور اہلِ کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہو گی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی. ان کو مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا" مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہو گا یا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کر لے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے. خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ" براہِ کرم اس کی توضیح کیجئے کہ ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اصولوں

پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ احساس برتری (SUPERI-ORITY COMPLEX) کے بارے میں مزید روشنی ڈالیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (JUSTIFICATION) کے لیے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کیریکٹر کے اصولوں پر پورے اتریں گے؟ آج کے مسلمان کی بات تو الگ رہی، کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں اکثر و بیشتر جو لوگ اسلام لائے وہ زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمایئے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تیس پینتیس سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علیؓ جیسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی اور مخالفین میں حضرت عائشہؓ صاحبہ تک تھیں؟

آپ حکومتِ الٰہیہ کے خواہاں ہوتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا آپ حکومتِ الٰہیہ ملکی حدود کے بغیر ہی نافذ کر سکیں گے۔ یقیناً نہیں، تو پھر آپ کی حکومتِ الٰہیہ کے لیے ملکی حدود بہر حال وہی موزوں ہو سکتی ہیں جہاں مسٹر جناح اور ان کے حواری پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آپ پاکستان کی حدود کے علاوہ کیوں سارے ہندوستان میں حکومتِ الٰہیہ نافذ کریں گے؟ نیز یہ گرہ بھی کھولیے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرزِ حکومت کو چلانے کے لیے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کیریکٹر کی شخصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے جب کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانِ غنیؓ جیسے عدیم المثال بزرگ اسے

چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیشِ نظر ہیں جن کی بنا پر آپ کی دور رس نگاہیں حکومتِ الٰہیہ کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور شور سے پھیل رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ عین اسلام ہے مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گزشتہ سطور میں پیش کیا ہے۔ یعنی آپ کے پاس عہدِ خلافتِ راشدہ کی اصولی حکومت چلانے کے لیے فی زمانہ کیرکٹر کے آدمی کہاں ہیں پھر جب کہ وہ بہترین نمونہ کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں ایک چیز اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کچھ مدت پہلے میرا یہ خیال تھا کہ ہم ہندوؤں میں ہی ایک مشترکہ نصب العین نہیں ہے بخلاف اس کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی ہے اور ان کے سامنے واحد نصب العین ہے لیکن اب اسلامی ریاست کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا حال ہم سے بھی دگرگوں ہے۔ آپ سے چھپاؤں گا نہیں میں نے تقریباً مختلف مراکزِ فکر کے مسلم رہنماؤں سے ان کے نصب العین اور طریقۂ کار کے بارے میں ایک متلاشیِ حق کی حیثیت سے چند ایک امور جو میرے لیے تحقیق طلب تھے دریافت کیے۔ ان کے جوابات موصول ہونے پر میرا پہلا خیال غلط نکلا اور معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں بھی طریقۂ کار اور نصب العین کے بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

(اس موقع پر مستفسر نے جماعتِ اسلامی سے اختلاف رکھنے والے بعض اصحاب کی تحریروں سے چند سطور نقل کی ہیں۔ انھیں حذف کیا جاتا ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ آپ کے مشترک العقیدہ رہنما کس شدید اختلاف آراء میں مبتلا ہیں۔ ان ٹھوس حقائق اور واقعات کو نظر انداز کر کے محض کتابوں کے صفحات پر ایک چیز کو نظریہ کی شکل میں پیش کر دینا اور بات ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا قطعاً مختلف چیز ہے۔ سیاست ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کیا آپ میرے اس سارے التماس کو سامنے رکھ کر اپنے طریقۂ کار اور راہِ عمل سے بہ تفصیل مطلع فرمائیں گے؟

جواب:۔

آپ کے سوالات کا سرا حقیقت میں ابھی تک میں نہیں پا سکا ہوں۔ اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات نکل آتے ہیں جن کے نکلنے کی مجھے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر بتدریج فروعی معاملات اور وقتی سیاسیات (CURRENT POLITICS) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے سر دست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں اس میں ذمّی اور اہلِ کتاب کی حیثیت وہی ہو گی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے"۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یا تو آپ ذمّیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں یا ہندوؤں میں اچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اوّل تو اچھوتوں کی جو حیثیت منو کے دھرم شاستر سے معلوم ہوتی ہے اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے اور ذمّیت کی بنیاد محض عقیدہ پر۔ اگر ذمّی اسلام قبول کرلے تو وہ ہمارا امیر و امام تک بن سکتا ہے مگر ایک شودر کسی عقیدۂ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد ورن آشرم کی پابندیوں

سے بَری نہیں ہوسکتا ہے۔

آپ کا یہ سوال بہت ہی عجیب ہے کہ کیا ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لاکر اسے چلانے میں شریک ہوسکتا ہے؟ شاید آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسلامی حکومت کے اصولوں پر ایمان لے آنے کے بعد ہندو ہندو کب رہے گا۔ وہ تو مسلم ہو جائے گا۔ آج جو کروڑوں "ہندو زادے" اس ملک میں مسلمان ہیں وہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لاکر ہی تو مسلمان ہوئے ہیں اسی طرح آئندہ جو ہندو زادے اسے مان لیں گے وہ بھی مسلم ہو جائیں گے اور جب وہ مسلم ہو جائیں گے تو یقیناً اسلامی حکومت کو چلانے میں وہ ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔

آپ کا یہ سوال کہ آیا "ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں" جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذمّی گروہوں کو حاصل ہوگا دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہِ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے اس کی اجازت بھی ذمّیوں کو ہوگی۔ مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مآل یہ ہو کہ ملک کا نظامِ زندگی تبدیل ہوکر اسلامی اصولوں کی بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدودِ اختیار میں کسی کو نہیں ہونے دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون "اسلام میں قتلِ مرتد کا حکم" ملاحظہ فرمائیے[1]۔

اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہلِ کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساسِ برتری پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک

---

[1] یہ مضمون اب کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے۔

نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنا لے گی۔ اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اسی لیے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلموں سے کریں البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبولِ عام حاصل ہو بلکہ بعض حالات میں تو اسے روکا بھی گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے سے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشو و نما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پینتیس سال چل کر کیوں رہ گئی ایک اہم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہ ہو گا۔ کسی خاص اصول کی علمبردار جماعت جو نظام زندگی قائم کرتی ہے اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لیڈرشپ ایک ایسے چیدہ گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا سچا اور سرگرم پیرو ہے اور لیڈرشپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جب کہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عظیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہو کہ اسے اس خاص اصول

کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لیے تیار بھی نہ ہو جو اس اصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقہ کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیے۔

نبی کریمؐ کے زمانہ میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا جو نیا نظامِ زندگی قائم ہوا اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب MORAL REVOLUTION واقع ہو چکا تھا اور آں حضرتؐ کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا اس کی قیادت تمام اہلِ عرب نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن آگے چل کر عہدِ خلافتِ راشدہ میں جب ملک پر ملک فتح ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی مملکت میں توسیع بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ چونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج ہیں اور نہ وسائل حمل و نقل موجودہ زمانہ کے مانند تھے اس لیے جو فوج در فوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے ان کو اخلاقی ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں مکمل طور پر جذب کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن اصولاً ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہو سکتی تھی اسی وجہ سے جب حضرت علیؓ کے زمانہ میں رجعی تحریکیں[1] REACTIONRY MOVEMENTS رونما ہوئیں تو مسلمان پبلک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہو گیا اور لیڈر شپ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جو ٹھیٹھ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرّہ برابر بھی دل شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت تیس پینتیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے انسانوں

---

[1] یعنی جن کا مقصد اسلام سے پھر کسی نہ کسی طرح کی جاہلیت کی طرف پلٹ جانا تھا۔

کا منظم کرسکیں جو اسلام کے منشاء کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کرسکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظم ہوجانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جاسکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہوسکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدانِ عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہوجائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ سے تیار کرنا اس وقت میرے پیشِ نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

"حکومتِ الٰہیہ" اور "پاکستان" کے فرق کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا جواب آپ میری کتابوں میں پاسکتے تھے مگر وہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد قومیت کے اصول پر ہے یعنی مسلمان قوم کے افراد جہاں اکثریت میں ہوں وہاں انھیں اپنی حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہو۔ بخلاف اس کے تحریک حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد اسلام کا اصول ہے۔ پاکستان صرف ان لوگوں کو اپیل کرسکتا ہے جو مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حکومتِ الٰہیہ کی دعوت تمام انسانوں کو اپیل کرسکتی ہے۔ خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا پیدائشی ہندو یا کوئی اور۔ پاکستان صرف وہیں قائم ہوسکتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس بات کی بہت کم توقع ہے کہ اس تحریک کے نتیجہ میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ کیونکہ خالص اسلامی حکومت کا قیام جس اخلاقی انقلاب پر منحصر ہے وہ پاکستان کی تحریک سے رونما نہیں ہوسکتا۔ لیکن حکومتِ الٰہیہ اس کی محتاج نہیں ہے کہ کسی جگہ مسلمان قوم کی اکثریت پہلے سے موجود ہو۔ وہ تو ایک اخلاقی اور ذہنی اور تمدنی انقلاب کی دعوت ہے اور

سارے انسانوں کے لیے خود اللہ کی فلاح کے چند اصول پیش کرتی ہے، اس دعوت کو اگر پنجاب یا سندھ سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کریں تو حکومتِ الٰہیہ یہاں قائم ہو سکتی ہے اور اگر مدراس یا بمبئی یا کوئی دوسرا علاقہ پیش قدمی کر کے اسے قبول کرے تو حکومتِ الٰہیہ وہاں قائم ہو سکتی ہے۔ ہم اس دعوت کو مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی ہر ایک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مسلمانوں کی کوئی قومی جائداد نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی فلاح کے چند اصول ہیں ہو سکتا ہے کہ پیدائشی مسلمان اس دعوت کو قبول کرنے میں کوتاہی دکھائیں اور پیدائشی ہندو آگے بڑھ کر اسے قبول کریں۔

آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں ایک مشترکہ مقصد اور نصب العین کا فقدان ہندوؤں سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسلام سے بے نیاز ہو کر دنیوی معاملات کو خواہشاتِ نفس اور غیر مسلم طور طریقوں کی تقلید سے حل کرنے کی کوشش کا۔ اگر مسلمان خالص اسلامی اصول پر اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو آپ ان کو ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین کے پیچھے اپنی ساری قوتیں صرف کرتے ہوئے پاتے آپ نے مسلمانوں کے اندر خیالات اور اعمال کا جو انتشار محسوس کیا ہے اسے میں بھی ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور ہماری اسلامی تحریک کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا جو رویّہ ہے وہ بھی میری نگاہ میں ہے۔ مگر ان چیزوں سے میرے اندر کوئی بددلی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان باتوں کی تہہ میں جو اصل خرابی ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ میں بددل نہیں ہوں بلکہ ایک بڑی حد تک پُر امید ہوں جیسا کہ آپ نے خود بھی تحریر فرمایا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تیزی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرتا جا رہا ہے کہ جو چیز میں پیش کر رہا ہوں یہی اصل اور خالص اسلام ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے موجودہ مختلف گروہ جس طرز پر کام کر رہے ہیں اس سے ان کا فلاح کی منزل تک پہونچنا تقریباً محال ہے۔ لہٰذا اس امر کا قوی امکان ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمان نوجوان ان مختلف گروہوں سے اور ان کی سیاست

سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کے لیے خالص اسلام کے اصولوں پر کام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی جب قوم پرستی سیاسی آزادی کی منزل پر پہنچ جائے گی تو انھیں سیاست اور معاشرت اور تمدن کی مشینری کو چلانے کے لیے کچھ اصول درکار ہوں گے اور وہ گاندھی جی کے فلسفے میں یا کانگریس کی وطن پرستی اور ہندو مہا سبھا کی قوم پرستی میں نہ مل سکیں گے۔ اس وقت ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہوں گے یا تو اشتراکیت کے اصولوں کو اختیار کریں یا پھر اسلام کے اصولوں کو قبول کریں۔ اس موقع کے پیش آنے تک اگر ہم اصولِ اسلام کے بے لاگ داعیوں کا ایک صالح گروہ منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مجھے ۸۰ فی صدی امید ہے کہ ہم اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اشتراکیت سے بچانے اور اسلام کے اصولوں کی طرف کھینچ لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہمارے اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں اور ہندوؤں کی موجودہ قومی کش مکش ہے۔ مگر ہم امید کرتے ہیں کہ جس طریقہ پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے ہم ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری غیر مسلم قوموں کے اس تعصب کو جو وہ اسلام کے خلاف رکھتے ہیں بالآخر دور کر دیں گے۔ اور انھیں اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ اسلام کو خالص اصولی حیثیت سے دیکھیں، نہ کہ اس قوم کے مذہب کی حیثیت سے جس کے ساتھ دنیوی اغراض کے لیے ان کی مدتوں سے کش مکش برپا ہے۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ نومبر، دسمبر ۴۴ء)

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت

سوال[1]:۔ کن اصول، خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی

---

[1] یہ دراصل وہ سوالنامہ ہے جو مسلم لیگ کی مجلسِ عمل کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اور منجملہ دوسرے اصحاب اور ادارات کے مدیر ترجمان القرآن کو بھی بھیجا گیا تھا۔

اصلاح ان حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں، اسلامی اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہِ کرم حسب ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجئے۔

ا۔ ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجئے جس کے ذریعہ قومی احیاء کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارسِ فکر کو متحد اور مربوط کیا جاسکے۔

ب۔ ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجئے جو اصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

ج۔ ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انھیں ذہن میں رکھ کر بتایئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر اور جب وہ ایسی آزاد ریاستیں حاصل کرلیں جن میں ان کی اکثریت ہو تو ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کرسکیں جس میں مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

د۔ اسلامی اصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجئے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

ر۔ مجموعی قومی بہبود کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجئے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔"

جواب :-

آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزا ہیں۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ "مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنھیں

بنانا قرآن کا اصل منشا تھا“ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ انسان سے اس کے مطالبات ہیں واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انھوں نے اسے قبول کیا ہے ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادے کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا، اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا۔ (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مدارات و مصالحت (COMPROMISE) اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا اس نصب العین اور اس اصول پر جو پارٹی کام کرے گی۔ اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آرہے ہیں اوّل تو سرے سے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوئے بھی تو وہ اس شکل میں نہیں ہوں گے۔ جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آرہے ہیں انھیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی۔ بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنا ہوگی جس سے بنی ہوئی اسکیم کو نافذ کر سکیں۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالت کو بزور بدلیں گے۔ تاکہ وہ اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل

شاید آپ نہ پا سکیں گے۔ وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے ننانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل اور بچانوے فی صدی منحرف اور نوے فی صدی انحراف پر مُصر ہیں۔ یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اس منشاء کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اس پورے مجموعہ کو جو اس وقت عملاً قائم ہے تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں اور پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے اور اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کچھ نہ پا سکیں گے۔

سوال:-

آپ کو علم ہو گا کہ مسلم لیگ نے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مجلسِ عمل کا تقرر کیا ہے پھر اس مجلس عمل نے مختلف ذیلی مجالس مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ انہی میں سے ایک مذہبی و معاشرتی حالات کی اصلاح کے لیے ہے جس کے داعی کی طرف سے آپ کو ایک سوالنامہ غالباً موصول ہو چکا ہو گا[1]۔ اس سوالنامہ کو خاص توجہ کا مستحق سمجھیے اور ہر طرح کے اختلافات کو نظر انداز کر کے فکری تعاون فرمایئے۔ غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ابھی تک مسلمانوں نے اپنی مذہبیت کو مغرب کے سیلاب الحاد کے مقابلہ میں بچا رکھا ہے، اگر اس نازک لمحہ میں ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو ممکن ہے کہ نوجوانانِ ملت ترکی اور ایران کے نقشِ قدم پر چل نکلیں۔

جواب:-

آپ کا عنایت نامہ آنے سے پہلے ہی میں لیگ کی مجلس عمل کو متذکرہ سوالنامہ کا جواب دے چکا ہوں۔ آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا۔ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ

---

[1] یہ وہی سوالنامہ ہے جو اوپر ہمارے جواب سمیت درج ہو چکا ہے۔

حصوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر (HALF MEASURES) میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں۔ نہ داغ دوزی (PATEH WORK) سے ہی مجھ کو کبھی دلچسپی رہی۔ اور مجلس عمل کے پیشِ نظر یہی کچھ ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیشِ نظر ہوتی تو میں بدل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ لیکن یہاں کل کو بجنسہٖ برقرار رکھتے ہوئے اس کے بعض اجزاء کو ہٹا کر ان کی جگہ بعض دوسرے اجزاء رکھنا مطلوب ہے جس کے لیے کوئی قابل عمل اور نتیجہ خیز صورت سوچنے سے میرا ذہن عاجز ہے میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقہ سے کوئی بہتر نتیجہ نکال کر دکھا دیا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں مسلکِ کلی سے مسلکِ جزئی کی طرف منتقل (CONVERT) ہو جاؤں۔

(ترجمان القرآن رجب، شوال ۶۳ھ جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

مطالبۂ پاکستان

سوال:-

ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ سارے عالم کو قانونِ الٰہیہ کے آگے مفتوح کر دے۔

لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے

ہیں۔ ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ! تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابلِ اعتراض نہیں؟

یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے، اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کردی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن ان کے قبضہ میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔

میرے خیال میں مسلمان۔ یا بالفاظِ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کررہی ہے وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی ہے اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کھڑا نہ کرے گی؟

جواب:۔

مطالبۂ پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم میں ملاحظہ فرمایئے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کا قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے، ان کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس ہوچکے ہیں۔ اسے اگر ان کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں بلکہ ان کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے بخلاف اس کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے۔ وہ بالفعل

مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے اس کو محفوظ رکھا جانے اور متحدہ ہندوستان ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یہ چیز وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انھیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کریں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔

ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی اور علمبردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک قوم ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطہ میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اس نظام کی جس کا وہ داعی

ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے قائم بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

جماعت اسلامی اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم

سوال:۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ صوبہ سرحد میں اس سوال پر ریفرنڈم ہو رہا ہے کہ اس صوبہ کے لوگ تقسیم ہند کے بعد اپنے صوبے کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرانا چاہتے ہیں۔ یا پاکستان کے ساتھ۔ وہ لوگ جو جماعتِ اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو اس استصواب میں رائے دینی چاہیے یا نہیں اور کس طرف سے رائے دینی چاہیے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس استصواب میں بھی ہماری پالیسی اسی طرح غیر جانب دارانہ ہونی چاہیے جیسی مجالسِ قانون ساز کے سابق انتخابات میں رہی ہے ورنہ ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو یہ ووٹ آپ سے آپ اس نظامِ حکومت کے حق میں بھی شمار ہوگا جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے۔

جواب:۔

استصواب رائے کا معاملہ مجالسِ قانون ساز کے انتخابات کے معاملے سے اصولاً مختلف ہے۔ استصواب رائے صرف اس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو۔ ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں رائے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ لہٰذا جن علاقوں میں استصواب رائے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکانِ جماعتِ اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں رائے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف

سے کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔ جماعت اپنے ارکان کو صرف ان امور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو رائے چاہیں دے دیں۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔

پاکستان کے حق میں ووٹ دینا لازماً اس نظامِ حکومت میں ووٹ دینے کا ہم معنی نہیں ہے جو آئندہ یہاں قائم ہونے والا ہے۔ وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تو ہم دل و جان سے اس کے حامی ہوں گے اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اسے تبدیل کر کے اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی جدوجہد اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔

(سہ روزہ کوثر مورخہ ۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

حکومتِ الٰہیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق

سوال:۔

رسالہ پیغامِ حق میں ابو سعید بزمی صاحب نے اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

اسلامی سیاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بڑے زور و شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو تاریخی حیثیت

سے یہ اصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصہ تک تھیاکریسی (THEOCRACY) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ خدا کوئی ناطق ادارہ نہیں اس لیے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار و اقتدار مل جائے وہ بڑی آسانی سے اس کا غلط استعمال کرسکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقۂ خیال کے لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ ان کا تصور سیاست پاپائے اعظم کے تصور سے مختلف ہے۔ لیکن چونکہ وہ عوام کو جوابدہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمہوریت کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس لیے نتیجتاً ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔

"پھر بزمی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ براہِ کرم ترجمان القرآن کے ذریعہ اس غلط فہمی کا ازالہ فرمادیں اور صحیح نظریہ کی توضیح کردیں۔"

جواب :۔

بزمی صاحب نے غالباً میرا مضمون "اسلام کا نظریۂ سیاسی" ملاحظہ نہیں فرمایا ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انھوں نے میرے مسلک پر کیے ہیں ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے لیکن اگر انھوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کیے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ اظہار تعجب کردوں اور کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ میرے اس مضمون میں یہ عبارتیں قابلِ ملاحظہ ہیں :۔

"یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے۔ اسلامی تھیاکریسی اس سے بالکل مختلف ہے یورپ اس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کردیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور عام مسلمان اسے خدا کی کتاب

اور رسولؐ کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرزِ حکومت کو الٰہی جمہوری حکومت (THEO DEMOCRATIC STATE) کے نام سے موسوم کروں گا کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حکومت عطا کی گئی ہے اس میں عامہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔"

پھر میں نے اوپر کی عبارت کے نیچے حاشیہ میں اس کی مزید تشریح کی ہے کہ:۔

"عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انھیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔"

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے میرے اس اشارہ کو جو میں نے ان چند فقروں میں کیا ہے سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا۔ جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی۔ جو نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جا سکے گا۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تھیاکریسی قائم کی تو اس کے لیے ایک قانون شریعت بھی وضع کیا جو ظاہر ہے کہ وحی و الہام سے ماخوذ نہ تھا بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے جو نظامِ عقائد، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کیے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی

طرح انھوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ انتظامی نیز انھوں نے نظام کلیسا کے کارپردازوں کے لیے جو حقوق اور اختیارات تجویز کیے تھے، اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے ان کے لیے بھی کوئی ماخذ ان کی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انھوں نے تھیاکریسی رکھ دیا ہو لیکن وہ فی الحقیقت تھیاکریسی نہیں تھا، اس کو آخر اسلام کی حکومتِ الٰہیہ یا شرعی حکومت سے کیا مماثلت ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے کتاب و سنت کی صورت میں بالکل واضح اور ناقابلِ حذف و ترمیم قانون موجود ہے اور جس کو چلانا کسی مخصوص مذہبی طبقے کا اجارہ نہیں ہے۔

پھر برقی صاحب کا یہ ارشاد بالکل عجیب ہے کہ "ہم خلیفہ کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو عیسائیوں میں پوپ کی حیثیت ہے اور یہ کہ ہم اسے عوام کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے"اس کے جواب میں میں پھر اپنے اسی مضمون کی چند عبارتیں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور: ۵۵) سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے، یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔"

پھر آگے چل کر میں نے لکھا ہے:۔

"یہاں ہر شخص خلیفہ ہے کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمراں بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور

دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔"

اس کے بعد میں نے پھر اسی مضمون میں دوسرے مقام پر تصریح کی ہے کہ:-

"اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے خلیفہ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز ہو گئی ہے۔

اس کے بعد یہ فقرہ بھی میرے اسی مضمون میں موجود ہے کہ:-

امیر تنقید سے بالاتر نہیں ہوگا۔ ہر عام مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ اس کی پرائیوٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابلِ عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکے گا اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلسِ شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اس امر میں بھی کوئی مانع شرعی نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے ..... ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار لا سکتی ہے۔"

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہماری تھیاکریسی کو پاپایانِ روم کی قائم کردہ تھیاکریسی سے مشابہ قرار دے تو بہرحال ہم اسے اس کی آزادئ رائے سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ مگر یہ ضرور عرض کردیں گے کہ یہ رائے علم و دلیل سے آزاد ہے۔

(ترجمان القرآن رجب ۶۵ھ جون ۴۶ء)

نظامِ کفر کی قانون ساز مجالس میں

مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال :-

آپ کی کتاب "اسلام کا نظریۂ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو دل نشین ہوگئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر بنی ہوئی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کریں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہو جانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں گے۔ پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟

جواب :-

آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے سرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امر حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود واضع حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؛

آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس کو تسلیم کرائیں خود اپنی زندگی کو اس پر قائم کریں۔ اور دنیا میں اس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی موافقت کریں اور اس کو اپنا لیں اور اسے مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں اور ان کا مفاد اگر اس غلطی سے وابستہ ہے تو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ ایسے مفاد کی پروا کی جائے اور ایسی صورت حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ لگ کر جہنم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امرِ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حق کو حق جاننے کے باوجود خلافِ حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظامِ حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے۔ اور اگر نظامِ باطل کے کل پرزے نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کردیں گے حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کرکے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کردیں دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے وہ دینِ حق پیش کریں جس

کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے اور قرآن کے ذریعہ سے سیرت رسولؐ کے ذریعہ سے اور اخلاق اسلامی کے ذریعہ سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی، تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس مادی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کریں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے۔ (جس کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے) تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کے ہاتھ آجائے گا۔ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا۔ ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور خود وہ قومیں جو آج تک ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، مسخر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے (اور یہی اس وقت تک متوقع بھی ہے) کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظم ہو کر ایک طاقت بنے، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے رہے اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کیوں کہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل جائے گا۔ البتہ اگر سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی امر حق اور اس کے

تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض قوم اور اس کے مفاد کی فکر میں ان باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو رہی ہے تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو خیر کیا بلند ہو گا، مسلمان قوم اس ذلت و خواری اور اس پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرف اس لیے مبتلا ہوئی ہے کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے منہ موڑا۔

(ترجمان القرآن محرم ۶۵ھ دسمبر ۴۵ء)

غیر اسلامی اسمبلیوں کی رکنیت اور نظامِ کفر کی ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے

سوال:-

مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؛ اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ پڑ رہا ہے حتیٰ کہ علما تک کا مطالبہ یہی ہے اگرچہ مجملاً جانتا ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں مگر تاوقتیکہ معقول وجوہ پیش نہ کر سکوں ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔

"یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ سرکاری ملازمت کی حیثیت کیا ہے؟ اس معاملہ میں بھی سرسری طور پر میری رائے عدم جواز کی طرف مائل ہے مگر واضح دلائل سامنے نہیں ہیں۔"

جواب :۔

اصولی حیثیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ موجودہ زمانہ میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگانِ ملک اپنے دنیوی معاملات کے متعلق تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اصول خود وضع کرنے اور ان پر تفصیلی قوانین وضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریہ سے بالکل برعکس ہے اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی جز یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے ہدایت اور حکم دینا اس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانونِ زندگی اخذ کریں۔ نیز اگر اپنی آزادیٔ رائے اختیار کریں بھی تو ان حدود کے اندر کریں جن میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریے کی رو سے قانون کا مآخذ اور تمام معاملات زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت قرار پاتی ہے اور اس نظریہ سے ہٹ کر اول الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصولوں پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے کیوں کہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں کہ جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علماء کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجئے۔ اس مسئلہ کی تفصیل اگر آپ سمجھنا چاہیں تو میری کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم اور اسلام کا نظریۂ سیاسی ملاحظہ فرمائیں۔

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ نہ لیں اور نظامِ حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات

پہونچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اصولاً حرام ہو۔ حلال ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھہرالیا جائے۔ اضطرار کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں۔ پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور بجائے خود اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں جو نظام اس وقت مسلمانوں پر مسلّط ہوا ہے جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیلِ اضطرار بنا رہے ہیں وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ قوت و عمل اس نظام کے بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں۔ وہ اس اضطرار کو حجّت بنا کر اسی نظام کے اندر حصّہ دار بننے اور پھلنے پھو۔لنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری چیز جو آپ نے دریافت کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک انفرادی معاملات کا تعلق ہے ایک فردِ مسلم اگر کسی فردِ غیر مسلم سے اجرت یا تنخواہ پر کسی خدمت کے ادا کرنے کا معاملہ طے کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ خدمت براہِ راست کسی حرام سے متعلق نہ ہو۔ لیکن علماء کا ایک بڑا گروہ اس بنیاد پر حکومت کفر کی ملازمت کو جائز ٹھہرانے کی جو کوشش کرتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ لوگ اس اصولی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ایک فردِ غیر مسلم کے شخصی کاروبار اور ایک غیر اسلامی نظام کے اجتماعی کاروبار میں ہے ایک غیر اسلامی نظام تو قائم ہوتا ہی اس غرض کے لیے ہے اور اس کے سارے کاروبار کے اندر بہر حال اور بہر پہلو میں مضمر ہی یہ چیز ہوتی ہے کہ اسلام کے بجائے غیر اسلام، طاعت کے بجائے معصیت اور خلافتِ الٰہی کے بجائے خدا سے بغاوت، انسانی زندگی میں کار فرما ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز حرام اور تمام محرمات سے بڑھ کر حرام ہے۔ لہٰذا ایسے نظام کو چلانے والے شعبوں میں یہ تفریق نہیں کی جاسکتی کہ فلاں شعبے کا کام جائز نوعیت کا ہے

اور فلاں شعبے کا..... ناجائز۔ کیونکہ یہ سارے شعبے مل جل کر ایک بڑی معصیت کو قائم کر رہے ہیں۔ اس معاملہ کی ٹھیک نوعیت سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی کہ اگر کوئی ادارہ اس غرض کے لیے قائم ہو کر عامۃ الناس میں کفر کی اشاعت کرے اور مسلمانوں کو مرتد بنائے تو اس ادارہ کا کوئی کام اجرت پر کرنا خواہ وہ کام بجائے خود حلال قسم کا ہو (مگر اس ادارے کی تقویت اور اس کے کام کو فروغ دینے کے لیے بہر حال ناگزیر ہو) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔

اس معاملہ میں بھی آخر کار مسلمان اضطرار والی حجت پیش کرنے پر اتر آتے ہیں کہ اگر ہم اس حکومت کی مشینری میں کل پرزے نہ بنیں گے تو غیر مسلم اس پر قابض ہو جائیں گے اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ لیکن اس کا جواب وہی ہے جو پہلے مسئلہ میں اضطرار کی دلیل پر دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن محرم ۶۵ھ، دسمبر ۴۵ء)

پر امن انقلاب کا راستہ

سوال:۔

ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں براہ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انھیں صاف کر دیجئے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر حضرت یوسفؑ کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انھوں نے جب ریاست کو اقتدار کلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا

ہے اس قسم کا طریق کار اختیار کیا جاسکتا ہے اس سوال کے جواب میں آپ نے جو لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا[1]۔ مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسفؑ کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبیؐ کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ نبیؐ نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہمارے لیے بھی طریق کار اب یہی ہے! واضح فرمائیے کہ میری یہ رائے کس حد تک صحیح ہے یا غلط ہے؟

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں سے نظام باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جا سکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہوگا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔

جواب:۔

ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السّلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اس طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرز عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس طریق کار کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسا وہ نبی کریمؐ سے مسنون ہو۔

نبی کریمؐ کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی۔ وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ یہ بات اگر

---

[1] یہ خط اور اس کا جواب اس مجموعہ کے آخری باب میں "ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار" کے زیرِ عنوان درج ہے۔

یوسفؑ کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبیؐ کریم نے اس پر لعنت بھیجی اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسفؑ کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسفؑ کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کبھی ہم کو اگر یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظام حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں گے تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

(۲) الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (SECULAR) جمہوری (DEMOCRATIC) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:۔

اولاً ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

(ترجمان القرآن محرم ۶۵ھ دسمبر ۴۵ء)

ملک کے نظم اور امن کی پاسداری

سوال:-

کیا کافر حکومت کے اندر رہتے ہوئے یہ جائز ہے کہ آدمی لائسنس کے بغیر یا مقررہ موسموں کے علاوہ اوقات میں شکار کھیلے اور بغیر لیمپ کے راتوں کو موٹر یا بائیسکل چلائے؟

جواب:-

اگر آپ ایک ایسی حکومت کے اندر رہتے ہیں تو انتظام ملکی کو برقرار رکھنے کے لیے جو ضابطے اس نے بنائے ہیں اور جو قوانین بہر حال ایک منظم سوسائٹی کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہیں، انھیں خواہ مخواہ توڑنا آپ کے لیے درست نہیں ہے۔ قانون شکنی ہم صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ہم ایسی پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ نظم (ORDER) کو توڑ کر جلدی سے جلدی دوسرا اصالح تر نظم قائم کر سکیں اور اس صورت میں بھی صرف وہ قوانین توڑے جائیں گے جن کا توڑنا اس مقصد خاص کے لیے مفید اور ضروری ہو ورنہ قانون شکنی کے معنی بدنظمی (DISORDER) پیدا کرنے کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں نظم دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ بدنظمی اس لیے اگر آپ خواہ مخواہ اس کی زمین کا نظم بگاڑیں گے تو اس کی تائید سے محروم رہیں گے۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۴ھ جنوری، فروری ۴۵ء)

غیر اسلامی حکومت کے ذریعے تحصیل زکوٰۃ

سوال:-

حالات حاضرہ کا پیدا کردہ ایک سوال دریافت کرتا ہوں، یہ کہ کیا ہماری شریعت میں کسی کافر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہم سے صدقات واجبہ وصول کرے یا یہ کہ حکومتِ کفر کی قانونی قوت کے ذریعہ ان کی وصولی کا اہتمام کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ اسمبلی میں ایک زکوٰۃ بل پاس کرا لیا جائے؟ امید ہے واضح جواب دیا جائے گا۔"

جواب:-

زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا نظام اگر قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مسلمانوں کا کوئی آزاد اجتماعی نظام ہو۔ جو با اختیار بھی ہو اور وہ اس کو انجام دے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ایسی اسمبلی میں زکوٰۃ بل پاس کرایا جائے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے، اور جو قانون اسلام کو بالاتر قانون تسلیم نہیں کرتی تو یہ چیز شرعاً بالکل غلط ہے اور اس طریقہ سے اگر غیر مسلم حکومت کے زیر اثر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام کیا گیا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

(ترجمان القرآن، شوال ۶۵ھ، ستمبر ۴۶ء)

جماعتِ اسلامی
اور
اس کی تحریک سے متعلق

تحریک اقامتِ دین کے بارے میں چند سوالات

سوال :-

جماعت اسلامی کی شرکت کو اپنے لیے لازمی سمجھ لینے کے باوجود مجھے چند شبہات اپنے دل میں کھٹکتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اپنی بصیرت سے ان الجھنوں کو صاف کر دیجئے۔ شبہات یہ ہیں :-

۱۔ آپ اپنی تحریروں کے ذریعہ برسوں سے اقامتِ دین کی دعوت دے رہے ہیں۔ دو سال سے جماعت بھی قائم ہے۔ بقول آپ کے اس تحریک کے مزاج کے مطابق بہت تھوڑے آدمی ملے ہیں اور جو ملے ہیں ان میں وہ صفات بہت کم ہیں جن صفات کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ صفات لوگوں میں کیسے پیدا ہوا کرتی ہیں جہاں تک امت کی تاریخ کا تعلق ہے خلافتِ راشدہ کے بعد اقامت دین کی منظم تحریک کبھی بروئے کار آئی ہی نہیں۔ مجددین نے زبان وقلم یا جسم سے جو کچھ کیا ذاتی طور پر کیا۔ شاید پورے اسلامی دور میں صرف حضرت سید احمد بریلوی کے زیر علم ایک منظم جہاد اس مقصد کے لیے کیا گیا۔ میں ان کے رفقاء کے عزم وعمل پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں وہ والہانہ اور مجنونانہ جذب وجوش کیسے پیدا ہوا۔ کسی جماعت میں وہ نشہ کیسے چڑھا کرتا ہے جب وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان

کر دینا ہی اپنا عزیز فرض سمجھنے لگتی ہے۔ کیا یہ سب کچھ تحریری اور تقریری دعوت و تفہیم سے ہو جاتا ہے یا محض عمدہ اور صحیح لٹریچر فراہم کر دینے سے؟ میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب چیزیں ذہنی اصلاح تو کر دیتی ہیں لیکن جنونِ عمل پیدا کرنے والی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ عہد کر کے اس کا حق ادا نہیں کرتے اور خلوص و ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبہ کو کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میں آپ کا لٹریچر پڑھ کر اور قرآن حکیم کا مطالعہ کر کے خود اپنے اندر یہ خواہش پاتا ہوں کہ میرے عمل میں انقلاب ہو۔ لیکن جس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہوں وہ پیدا نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کون سی طاقت ہے جو اس ضرورت کو پورا کرتی ہے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک جماعت اسلامی میں یہ طاقت نمودار نہ ہوگی شرکائے جماعت میں ایثار و عمل کا مطلوبہ جذبہ پیدا نہ ہوگا اور تحریک ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

۲۔ ایک الجھن اقامتِ دین کی راہ کے نشانات اور مراحل کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح کے مراحل دیے گئے ہیں ان میں جس طرح کی رہنمائی ہوتی گئی اور جس طرح کی غیبی نصرت و تائید کا ظہور ہوتا گیا ان سب میں ذاتِ رسول اور وحی کی رہنمائی موجود تھی۔ اب یہ کون بتائے گا کہ ہمارے راستے کے مراحل کون کون ہیں اور ان کو کس کس طرح عبور کرنا ہے؟

۳۔ صحابہؓ کی زندگی کو دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے اونچے نیچے، محتاج اور غنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک وسیع خاندان کے رشتہ میں پرو دیے گئے تھے۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہوتی تھی، اور ایک کا فاقہ سب کا فاقہ ہوتا تھا۔ ایک کا بوجھ اٹھانے

کے لیے سب کے بازو حرکت میں آجاتے تھے۔ مگر ہمارا حال کیا ہے؟ اگر ہمارے بچے فاقہ کشی کر رہے ہیں اور ہم فکرِ معاش میں بدحواس ہو رہے ہیں تو ہم ان رفیقوں کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں جو ان مشکلات کی تلخیوں سے ناآشنا ہیں کبھی کبھی اس الجھن میں پڑجاتا ہوں کہ وہ زندگی جو عہدِ رسالت میں صحابہؓ کے اندر پیدا ہوگئی تھی اس عہد کے لیے خاص تو نہ تھی کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اس زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے کہ یہ عام نہیں ہوسکتی۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمیں اپنے جذبۂ رفاقت کو اتنا زوردار بنانا چاہیے کہ جماعت ایک خاندان کی شکل اختیار کرجائے اپنی جماعت کے استحکام کے لیے یہ ایک لازمی چیز ہے۔"

جواب:۔

(۱) اس مسئلہ پر میں خود برسوں غور کرتا رہا ہوں اور آخر کار اس مختصر سے فقرے نے جو عام طور پر مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے مجھے مطمئن کردیا، یعنی" السعی منی والاتمام من اللہ" میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم جس بات پر مامور ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مختلف راہوں میں سے اس راہ کو اپنے لیے منتخب کریں جسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے اور اپنی تمام ممکن سعی وجہد اس پر چلنے میں صرف کردیں۔ اس کے بعد اسباب کی فراہمی اور رہ نوردی کی قوت اور مشکلاتِ راہ کی تسہیل، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر بڑے پیمانے پر سعی کرنے اور بلند درجے پر پہونچنے کی توقع نہ ہو تو ہم صحیح راہ کو چھوڑ کر کسی ایسی غلط راہ کی طرف چل پڑیں جس میں کچھ بڑے اور بلند درجے کا کام کیا جاسکتا ہو۔ ہمیں بہر حال صحیح کام کرنا ہے، خواہ وہ بڑے پیمانہ پر ہو یا چھوٹے پیمانے پر۔

یہ تو اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن غیر معمولی اخلاقی قوتوں کی اس کام کے لیے ضرورت ہے اور جیسی مؤثر شخصیت یا شخصیتیں اس کام میں جان ڈالنے کے لیے ضروری ہیں وہ بہر حال حجروں میں پیدا نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ اس راہ کی عملی

جدوجہد کے نتیجہ ہی میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ابھی اس سعی کی ابتدا ہے اور آزمائش کے لمحات بہت کم آئے ہیں، اس وجہ سے اس سعی کے مردم ساز اثرات آپ کے سامنے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن آگے چل کر جیسے جیسے امتحان کے مواقع سامنے آتے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اللہ سے گہرا تعلق رکھنے والے نہیں ہیں وہ کسی نہ کسی امتحان کی گھڑی پر اپنی کمزوری کے خود شکار ہو جائیں گے اور راستے سے ہٹ جائیں گے اور جن لوگوں کو فی الواقع اللہ سے تعلق ہو گا وہ نہ صرف یہ کہ ایک ایک امتحان کے موقع پر کامیاب ہوں گے بلکہ ہر امتحان ان کی سیرت میں ایک نئی طاقت پیدا کر دے گا ان کے اندر کی بہت سی کھوٹ نکال دے گا اور بالآخر وہ زرِ خالص بن جائیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ انہی لوگوں میں پارس کی سی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی کہ جو ان سے چھو گیا وہ سونا بن گیا۔

بہر حال میں اس معاملہ میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ اس کام کو شروع کرنے سے پہلے مکمل شخصیت یا شخصیتوں کے موجود ہونے کی شرط لگانا غلط ہے۔ یہ شرط کبھی متحقق نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ ایک مرتبہ خلوص نیت کے ساتھ یہ کام شروع کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ یہی کام خود مکمل شخصیتیں بناتا چلا جاتا ہے اور جتنا جتنا یہ اپنی تکمیل کے مراحل کی طرف بڑھتا ہے اتنی ہی بلند تر شخصیتیں اس کے کارکنوں میں سے ابھرتی چلی آتی ہیں۔ سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے آپ ایسے آدمی کبھی نہیں لا سکتے جو سمندر کے اندر اترنے سے پہلے اس کی موجوں سے لڑنے کی قوت فراہم کر چکے ہوں یہ قوت تو بہر حال سمندر میں کودنے اور موجوں سے لڑنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جو کمزور ہیں وہ اسی سمندر میں ڈوب مرتے ہیں اور جن کے دست و بازو میں اللہ نے قوت پیدا کی ہے وہ تھپیڑے کھا کھا کر اور موجوں سے لڑ لڑ کر بالآخر پیراکوں کے پیراک بن جاتے ہیں

۲۔ اقامتِ دین کی راہ کے مراحل مقرر نہیں ہیں۔ بلکہ ان مراحل کو جدوجہد اور وہ حالات جو جدوجہد کے دوران میں پیش آئیں اور وہ بصیرت جو اسلام کی روح کو سمجھنے والے رہنما کے اندر ہوتی ہے، یہ سب چیزیں مل جل کر معین کرتی ہیں۔ انبیاء علیہم السّلام

کی زندگیوں میں بھی ہم کو یہی نظر آتا ہے۔ کہ سب کے سب ایک ہی قسم کے مراحل سے نہیں گزرے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل جو چیز درکار ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے مقصد معین ہو اور ہمارے اندر وہ حکمت موجود ہو جو اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے اور ہم انبیاء علیہم السلام کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ کر عملاً جدوجہد شروع کردیں۔ پھر جو مراحل سامنے آتے جائیں گے ان میں سے ہر مرحلہ کے تقاضوں کو ہم اپنی حکمت سے سمجھتے جائیں گے اور اللہ کے بھروسے پر ان کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتے جائیں گے۔

رہا آپ کا یہ خیال کہ پہلے تو وحی کی رہنمائی کام کرتی تھی اس لیے صحیح وقت پر صحیح تدبیر اختیار کرلی جاتی تھی۔ مگر اب کیا ہوگا؟ تو اس کا جواب قرآن مجید میں دیدیا گیا ہے کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) وہ خدا جو پہلے رہنمائی کرتا تھا وہی اب بھی رہنمائی کے لیے موجود ہے اس کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے والے موجود ہونے چاہئیں۔ ہمارے اندر اگر ایک دو آدمی بھی ایسے موجود رہیں جو قرآن کی روح اپنے اندر جذب کرچکے ہوں اور جماعت میں کم از کم ایک معتدبہ اکثریت ایسے لوگوں کی موجود رہے جو قلب سلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور صحیح و غلط رہنمائی میں امتیاز کرسکتے ہوں، اور جن میں صحیح رہنمائی کے لیے سمع و طاعت کا مادہ موجود ہو تو انشاءاللہ خدا کی رہنمائی بھی ہمیں ہر مرحلہ پر حاصل ہوگی اور ہم اس کی رہنمائی سے فائدہ بھی اٹھاسکیں گے۔

۲۔ صحابہؓ کی جماعت کے متعلق جو نقشہ تذکروں میں کھینچا گیا ہے اس میں ایک حد تک تو مبالغہ ہے اور ایک حد تک حقیقت ہے پھر جو حقیقت ہے وہ بھی پوری طرح اس وقت برسرکار آئی تھی جب ایک طویل مدت کی جدوجہد نے ان کے اندر باہمی رفاقت کی اسپرٹ پیدا کردی تھی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو خصوصیات ان کے اندر نبیؐ جیسے زبردست رہنما کی رہنمائی سے چودہ پندرہ سال کی مسلسل

تربیت کے بعد پیدا ہوئی تھیں انھیں ہم پہلے ہی مرحلہ پر موجود دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر مدینہ طیبہ میں صحابہؓ کے درمیان رفاقت کی جو اسپرٹ تھی اس میں بہت بڑا دخل ان کی یکجائی کو بھی تھا۔ منتشر طور پر عرب کے مختلف حصوں میں جو لوگ پھیلے ہوئے تھے ان کے ساتھ وہ رفاقت ممکن نہیں تھی جو مدینہ میں سمٹ آنے والے لوگوں کے ساتھ تھی مگر یہاں ابھی تک ہماری اجتماعی زندگی سرے سے بنی ہی نہیں ہے منتشر افراد ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو ابھی ایک دوسرے سے آشنا تک نہیں، ان کے اندر آخر رفاقت کی وہ شان کیسے پیدا ہو سکتی ہے جو صرف یکجائی زندگی ہی میں ممکن ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے ہم خیال ہیں وہ عہد صحابہؓ کو مجرد کرامتوں اور معجزات کی اسپرٹ میں سمجھنے کے بجائے فطری اسباب کے مطابق سمجھنے کی کوشش کریں ورنہ ہر وہ چیز جو اس دور میں پیدا ہوئی تھی اس کے متعلق ہم چاہیں گے کہ بس وہ چشم زدن میں کرامت کے طور پر رونما ہو جائے اور جب وہ اس طرح رونما نہ ہو سکے گی تو ہمارے دل ٹوٹ جائیں گے اس ذہنیت کے ساتھ ہم کبھی ان فطری اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کریں گے ہی نہیں جن سے وہ کیفیات یا کم از کم اس نوعیت کی کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اس لیے اور مل کر کام کیجئے اس راہ میں مصیبتیں اٹھائیے۔ پھر اگر اس طرز کی رفاقت کا ظہور نہ ہو تو البتہ آپ کو حق ہے کہ اس خدمت کی انجام دہی کے لیے معجزہ کی شرط لگائیں اور اپنے خدا سے مطالبہ کریں کہ اگر یہ خدمت ہم سے لینا چاہتا ہے تو معجزے صادر کرے۔

اس سلسلہ میں سوچنے والے اکثر جو غلطیاں کرتے ہیں ان کا ذکر کچھ اس انداز سے کرنے لگتے ہیں گویا ان ساری کمیوں کو پورا کرنا اور تمام ضروری چیزوں کو مہیا کر دینا کسی اور کا کام ہے اور خود ان پر اس باب میں کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ حالانکہ درحقیقت یہ کسی ایک شخص کا انفرادی کاروبار نہیں ہے بلکہ ہم سب کا مشترک کام ہے اور اس میں کوئی شخص بھی محض چند خامیوں کی نشاندہی اور چند چیزوں کی ضرورت ظاہر کر کے اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ خود اس کمی کو پورا کرنے

اور اس چیز کو مہیّا کرنے کی خدمت انجام نہ دے۔ جس کی ضرورت وہ بیان کر رہا ہے۔
(ترجمان القرآن جمادی الاوّل و ثانی ۶۳ھ ۔ مئی، جون ۴۴ء)

مخالفتیں اور مزاحمتیں

سوال :۔

میں اپنے حالات مختصراً پیش کرتا ہوں۔ مجھے بتلایئے کہ کون سا طریق کار اختیار کروں کہ میرے اسلام میں فرق نہ آئے۔

(۱) والدین اٹھتے بیٹھتے اصرار کر رہے ہیں کہ ملازمت پر واپس چلا جاؤں بحالتِ موجودہ وہ نہ صرف اپنا بلکہ خدا کا نافرمان بھی گردانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ صرف ایسے وقت پر والدین کی نافرمانی جائز ہے جب وہ یہ کہیں کہ خدا کو نہ مانو۔ باقی تمام امور میں والدین کا حکم شرعی طور پر واجب التعمیل ہے۔ عنقریب وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ نوکری پر چلا جاؤں تو بہتر ورنہ میرا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔ بس وہ اتنی رعایت مجھے دیتے ہیں کہ اگر میں مستقل طور پر ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم سال ڈیڑھ سال اور اختیار کیے رکھوں۔ حتیٰ کہ میرے چھوٹے بھائی بی، اے کر لیں اور میری خالی جگہ پُر کر سکیں اس سلسلہ میں گناہ وہ اپنے سر لیتے ہیں۔

(۲) ادھر عوام میں میری بے اثری بڑھ رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ جس ذوق و شوق سے دورانِ ملازمت میں لوگ میری بات سنا کرتے تھے یا حمایت کا دم بھرا کرتے تھے اب وہ ختم ہو رہا ہے بلکہ میری باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

(۳) بڑے بھائی بتلاتے ہیں کہ اگر نوکری حرام ہے تو زمینداری کون سی حلال ہے۔ ہماری زمین سرکار۔ (ایک ریاست) نے ہمارے آباؤ

اجداد کو بخشش کے طور پر دی تھی۔ وہ تو تمہارے نظریہ کی رو سے حلال آمدنی قطعاً نہیں دے سکتی۔ علاوہ بریں اسلام میں زمینداری سسٹم سرے سے ناجائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے دادا نے اپنی جائداد بروئے شریعت تقسیم نہیں کی تھی۔ ان کی وراثت صرف نرینہ اولاد میں چلی ہے اور مستورات کو محروم رکھا گیا ہے۔ پھر نوکری کو حرام کہنے کے بعد ایسی جائداد پر کوئی شخص کیسے بسر اوقات کر سکتا ہے؟

(۴) مسلمانوں کی اکثریت جہالت اور شرک میں مبتلا ہے۔ قبروں پر حاجات لے کر جانے اور نہ جانے کا سوال بہت اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس سلسلہ میں اگر مصلحتاً سکوت کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق کو قبول کرنے کے ساتھ لوگ شرک کرنے کی گنجائش کو بھی بحال رکھیں۔ یوں بھی مصلحت اندیشی تا کجے آخر بھانڈا پھوٹتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو کے رہتا ہے کہ ہم قبروں پر جا کر حاجات طلب کرنے کے خلاف ہیں۔ جہاں یہ بات کھلی بس فوراً ہی آدمی کو وہابی کا سرٹیفکٹ ملا اور کسی کو وہابی قرار دینے کے بعد لوگ اس کی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے بدکنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ بلوریں عقائد کے اس محل پر پتھر نہ پھینک مارے۔ جس کی تعمیر میں ان کے آباؤ اجداد نے پسینے بہائے ہیں اور جس کی حفاظت میں عمریں گزار دی گئی ہیں میں بھی اسی خدشہ کا ہدف بن رہا ہوں۔

جواب:۔

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ اب اسی مرحلہ پر پہونچ گئے ہیں جس سے میں نے آپ کو یہاں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس معاملہ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ اس کا فیصلہ بالکل اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر کرنا چاہیے اور اپنی ہمت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ بہر حال جو فیصلہ بھی آپ کریں ٹھنڈے دل سے کریں، اور خدا سے دعا مانگتے رہیں کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس کے بعد پسپائی کی نوبت

آئے پسپا ہونے سے اقدام نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

فیصلہ کو آپ کے ضمیر پر چھوڑنے کے بعد صرف ان دلائل کا جواب دیے دیتا ہوں جو آپ کے مقابلہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) عذاب وثواب کوئی کسی کا نہیں اٹھا سکتا۔ ہر شخص اپنے عذاب وثواب کا خود حامل ہے۔ میرے کہنے سے اگر آپ کوئی گناہ کریں تو میں کہنے کا گنہگار رہوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے کرنے کا گناہ بھی کہنے والے کی طرف منتقل ہو جائے اور آپ اس وجہ سے چھوڑ دیے جائیں کہ آپ نے دوسرے کے کہنے پر گناہ کیا تھا۔

(۲) والدین کی فرماں برداری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ان کی فرمانبرداری سے خالق کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر وہ کسی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرنا صرف یہی نہیں کہ فرض نہیں ہے بلکہ الٹا گناہ ہے۔

(۳) جس فعل کو آپ خود معصیت سمجھتے ہوں اسے ڈیڑھ دو سال تک صرف اس لیے کرتے رہنا کہ خاندان کا ایک اور فرد آپ کے بجائے اس معصیت کے لیے تیار ہو جائے بالکل ایک غلط فعل ہے اگر آپ اپنے عقیدہ میں صادق ہیں تو آپ کی یہ دلی خواہش ہونی چاہیے کہ نہ صرف آپ خود اس سے بچیں بلکہ خدا کا ہر بندہ اس سے محفوظ رہے۔

(۴) یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں زمینداری سرے سے ناجائز ہے۔ البتہ ہندوستان[1] میں زمینداری کی بعض شکلیں ایسی ضرور رائج ہو گئی ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ اگر شرعی طریقہ پر آپ زمینداری کریں اور ناجائز فائدے اٹھانے سے بچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) جو جائداد کسی شخص کو آباؤ اجداد سے ملی ہو اس کی سابق تاریخ دیکھنے کا شریعت نے اسے مکلف نہیں کیا۔ اس معاملہ میں قرآن کا قانون گذشتہ پر گرفت نہیں کرتا بلکہ حال اور مستقبل کی اصلاح ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب وہ جائداد اس کی ملکیت میں آئے اس وقت سے وہ اس میں شرعی

---

[1] موجودہ براعظم ہند و پاکستان

طریقہ پر تصرف کرے اور سابق میں جن لوگوں نے اس کو غلط طریقہ سے حاصل کیا تھا اور اس میں غلط تصرفات کیے تھے ان کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دے۔ البتہ اگر کوئی چیز آپ کے قبضہ میں ایسی ہو جس کے بارے میں آپ کو متعین طور پر معلوم ہو کہ اس میں فلاں فلاں لوگوں کے غصب شدہ حقوق شامل ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہوں۔ نیز ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو اپنی حد تک ان کے حقوق واپس کر دیجئے۔

(۶) ملازمت کے زمانہ میں آپ کے ذاتی اور خاندانی اثر کی بدولت جو لوگ آپ کا اثر قبول کر رہے تھے وہ حقیقت میں دین کی دعوت سے متاثر نہیں ہو رہے تھے بلکہ وہ جاہ و جلال کے بت کی پوجا کر رہے تھے اور آئندہ بھی اگر آپ اس پوزیشن پر رہیں تو یہ دھوکا نہ کھاییے گا کہ لوگوں کو آپ خدا پرست بنا رہے ہیں سچے خدا پرست تو وہی لوگ ہوں گے جو آپ کی دنیوی پوزیشن کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی دعوت کی سچائی اور آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر متاثر ہوں۔ میرے نزدیک تو آپ صحیح معنوں میں دعوت حق کے داعی اسی وقت بنیں گے جب تمام اعزازات آپ سے چھن جائیں، زمین آپ کو جگہ دینے سے انکار کر دے اور وہ سب جو کل تک آپ کے سامنے جھکے پڑتے تھے، آپ کو رد کرنے اور آپ سے منہ پھیرنے پر اتر آئیں۔ یہ صورتِ حال ہے تو بہت خطرناک لیکن اس راہ میں یہی کچھ مفید ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی طاقت دی کہ آپ اسے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس کا حقیقی فائدہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہو گا اور اسی وقت آپ کو اللہ تعالیٰ جھوٹے رفیقوں کی رفاقت سے بچا کر سچے رفیق بہم پہونچائے گا۔

(۷) عوام کے عقائد پر خواہ مخواہ باؤلے وہلہ ضرب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں "وہابیت" کے الزام سے بچنے کا اہتمام نہ کیجئے۔ لوگوں نے درحقیقت مسلمان کے لیے یہ دوسرا نام تجویز کیا ہے۔ وہ گالی

مسلمان کو دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کہہ کر گالی دیں تو اپنا اسلام خطرہ میں پڑتا ہے۔ اس لیے وہابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو جب آپ سمجھ جائیں گے تو پھر وہابی کے خطاب سے آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا۔ جو عقائد اور جو اعمال مشرکانہ ہیں ان سے بہرحال پرہیز کیجئے اور توحید کو اصلی تقاضوں کے ساتھ بے تکلف بیان کیجئے۔ شرک اور مشرکانہ باتوں سے پرہیز اور توحید اور مقتضیاتِ توحید کی پابندی اگر وہابیت ہے تو خدا اپنے ہر بندے کو وہابی ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر وہابی ہونے سے بچائے۔

سوال:۔

صوبجاتی اجتماع سے واپس آنے پر میں یکایک ان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آپ کی شدید مصروفیات کا علم رکھنے کے باوجود ان احوال کا تفصیلی تذکرہ آپ ہی کے اس ارشاد کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اس نوعیت کے امور سے آپ کو پوری طرح مطلع رکھنا ضروری ہے۔ خیر نو ۱۹؍اکتوبر کو والد مکرم کا جو گرامی نامہ موصول ہوا ہے وہ لفظ بلفظ[1] درج ذیل ہے۔

" برخوردار نور چشم۔ بعد دعائے ترقی درجات کے واضح ہو کہ اب تم خود مختار ہو گئے ہو۔ ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم مکان پر بیمار پڑے ہیں اور تم کو جلسہ[2] کی شرکت لازم اور ضروری۔ اب اللہ کے فضل سے نوکر ہو گئے ہو۔ ہم نے اپنی تمام کوشش سے تعلیم میں کامیاب کرایا اور اس کا نتیجہ پالیا۔ عالم باعمل ہو گئے کہ باپ کا حکم ماننا ظلم اور حکم خدا کے خلاف قرار پایا اوروں کا حکم ماں باپ سے زیادہ افضل۔ اخیر تمہاری کمائی سے ہم نے اپنی ضعیفی میں بڑا آرام پالیا۔ آئندہ ایک پیسہ بھی ہم لینا نہیں چاہتے۔ جو تمہارا جی چاہے کرو اور جہاں چاہے رہو،

---

[1] خط کا کچھ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔

[2] اشارہ ہے جماعت اسلامی کے اجتماع کی طرف۔

خواہ سسرال میں یا کسی اور جگہ البتہ ہم اپنی صورت اس وقت تک نہیں دکھلانا چاہتے جب تک جماعت سے استعفانہ دیدو۔ تم نے برابر اس مزاق میں " یعنی تحریک اسلامی کی خدمت میں" سب تعلیم کا کام خراب کر دیا۔ مگر ہمارا نصیحت کرنا بے کار ہے۔ بس یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے نہ آنا، ہمارا غصہ بہت خراب ہے۔ فقط

والد مکرم کے اس خط کا جواب راقم الحروف نے یہ لکھ دیا۔

" محترمی! کل آپ کا گرامی نامہ بدست...... موصول ہوا، اسے دیکھ کر آپ کی بیماری کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ یقین جانیے مجھے خبر تک نہ تھی کہ آپ بیمار رہیں۔ نہ آپ نے کوئی خط لکھا نہ مجھے کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا، ورنہ میں یقیناً وہاں نہ جاتا۔ یہ ایک عذر شرعی تھا جس کی بنا پر سفر کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔

والدین کے احسانات اور ان کی مہربانیوں کا کون انکار کر سکتا ہے پھر آپ نے تو اعلیٰ تربیت کی اور دینی تعلیمات سے آراستہ کیا۔ اسی تعلیم سے مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ دین کو دنیا میں غالب کرنا، خدا کے کلمہ کو بلند کرنا، دنیا میں اسلام کا سکہ چلانا اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے میں نے گرد وپیش کی دنیا پر نظر ڈالی اور مجھے ایک ہی جماعت اس مقصد کے لیے صحیح طریقہ اور اصلی اور بہترین ڈھنگ سے کام کرتی ہوئی نظر آئی اور وہ جماعت "جماعت اسلامی" ہے۔ اس لیے اگر مجھے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس سے منسلک رہنا ضروری ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ دین کے غلبہ کی کوشش اگر مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے؟

والدین کا حکم ماننا ضروری اور ان کی اطاعت فرض! لیکن کہاں تک؟ جب تک خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین کو غالب کرنا ضروری

ہے تو وہ کیا یونہی آرام سے بیٹھے ہوئے، بے انتھک کوشش کیے ہوئے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کوئی بہت سہل کام ہے؟ کیا دین کے لیے اتنی قوت اور اتنا وقت بھی صرف نہیں کرنا چاہیے جتنا ہم پیٹ کے لیے کرتے ہیں۔ کیا یہ کام تنہا ایک آدمی کے کرنے کا ہے۔ بہر حال دین کے لیے جس جماعت میں رہ کر بھی کام کیا جائے گا اس میں وقت بھی صرف ہوگا۔ مال بھی خرچ کرنا ہوگا، تکلیف بھی ہوگی۔ کچھ دنیاوی کاموں کا حرج بھی ہوگا اور کسی نہ کسی قوت سے تصادم کا ڈر بھی ہوگا اور آپ پھر منع فرمائیں گے۔ بھر للہ! آپ ہی بتایئے کہ اس کام کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔ آپ کی سرپرستی سے محروم ہو جانا میری انتہائی بدنصیبی ہے۔ لیکن یہ تو خیال فرمایئے کہ آپ کس چیز سے مجھے منع فرما رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہیں یہ حکم خدا کے خلاف تو نہیں ہے۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ: ۲۴)

ترجمہ: اے نبی فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان، تمہارے اموال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری وہ سوداگری جس میں گھاٹا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور تمہاری مرغوب آرام گاہیں تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں سر توڑ کوشش کرنے کے مقابلہ میں محبوب تر ہوں، تو انتظار کرو۔ اس گھڑی کا کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

میں سخت حیرت اور انتہائی افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ دین

کے غلبہ کے لیے جو کوشش میں کر رہا ہوں اس پر آپ ناراض ہیں آخر آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں میرا فرض کیا ہے؟ مندرجہ بالا آیت کو ملحوظ رکھ کر سوچئے۔

حاضر ہونے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کے عتاب سے خائف ہوں. دیکھیے آپ کیا اجازت فرماتے ہیں۔"

یہ جواب اس پس منظر کی بنا پر لکھا گیا تھا کہ والد صاحب وقت کی اضاعت، صرف مال اور خوفِ قوت متسلّطہ کی بنا پر...... جماعت میں کام کرنے سے منع کرتے ہیں، نیز یہ کہ ان کے اشارے پر..... سے ایک بہت مدلّل قسم کا طویل و عریض خط آیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ بہر حال حق و اسلام جماعتِ اسلامی میں منحصر نہیں. تنہا کام کیجئے یا کسی اور جماعت میں رہ کر۔

"والد محترم کی طرف سے مجھے ابھی تک منقولہ بالا عریضہ کا جواب نہیں ملا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہدایت سے مستفید فرمایئے۔"

جواب :۔

آپ نے والد کے عتاب پر جو جواب دیا ہے وہ بہت معقول ہے مسلمان کی زندگی ایک نہایت متوازن زندگی کا نام ہے. جس میں تمام حقوق و فرائض کا مناسب لحاظ ہونا چاہیے اور کسی حق یا فرض کی اضاعت نہ ہونی چاہیے۔ الآیہ کہ ایک حق کو دوسرے حق پر اس حد تک قربان کیا جائے جس حد تک ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو والدین کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے. لیکن بہر حال ہے خدا کے حقوق کے بعد ہی۔ اس پر مقدم کسی طرح نہیں ہے. پس جہاں خدا کا حق ادا کرنے کے لیے والدین کے حق میں کوئی کمی کرنا بالکل ناگزیر ہو۔ وہاں موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھتے ہوئے صرف اسی حد تک کمی کی جائے، اور ساتھ ساتھ ان کے عتاب اور خشم کو نہایت تحمل اور تواضع کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ ان کی سختی

کے مقابلہ میں اف تک نہ کیجئے۔ مگر جس چیز کو آپ اپنی دینی بصیرت کے مطابق دین سمجھتے ہیں اس سے والدین کو خوش کرنے کے لیے بال برابر بھی نہ ہٹیے، اولاد پر والدین کی خدمت، اطاعت اور ادب فرض ہے۔ لیکن ان کی خاطر ضمیر کی قربانی فرض نہیں ہے خصوصاً اس ضمیر کی جو دین کی روشنی سے منور ہو چکا ہو۔

اس معاملہ میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی متعدد صحابہ کرامؓ کو یہ مشکل پیش آچکی ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں صحابہ کرامؓ نے اپنے والدین کے ساتھ جو راہِ حق میں کسی نہ کسی طرح مزاحم ہو رہے تھے۔ جو طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس کو ملحوظ رکھیے۔

سوال:۔

ہمارے ہاں کے ایک نوجوان رکنِ جماعت..... میں اپنے بڑے بھائی کی زیر سرپرستی تجارت کر رہے ہیں یعنی دین میں احکام شریعت کی پابندی اور وقت پر نماز پڑھنے کے لیے چلے جانے کی بنا پر ان کے بڑے بھائی سخت برہم ہیں اور ان پر سختی کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے کئی خطوط میرے نام آچکے ہیں جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ "تیری (یعنی راقم الحروف کی) وجہ سے میرا بھائی خراب ہوگیا ہے اس پر دیوانگی طاری ہے کاروبار میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی رات دن تیرا وظیفہ پڑھتا ہے تو شیطان ہے انسان کی شکل میں ابلیس ہے۔ ماں باپ اور اولاد میں اور بھائیوں میں جدائی ڈالتا ہے۔ میرے بھائی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھ، اس کے نام نہ خط لکھ نہ ہی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے۔ بلکہ اس کو جماعت سے خارج کردے ورنہ۔" اس سلسلہ میں مناسب ہدایات سے سرفراز کیجئے۔

جواب:۔

جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہِ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں وہاں تو فی الواقع جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے

ایسے اعزہ واقربا اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں۔ بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیش نظر ہے لہٰذا جو الزام ہمارے رفیق کے بھائی نے آپ پر لگایا ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں بلکہ صاف صاف اعتراف کی ضرورت ہے اور بہت نرمی کے ساتھ ان کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اس جدائی کو میل اور موافقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو خدا پرستی اور دینداری میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار اور ساتھی بننے کی کوشش کریں ورنہ ہم اور ہمارا رفیق اپنے طرز عمل پر قائم رہیں گے اور آپ کو اختیار ہے کہ جو کچھ آپ کا نفس ہمارے ساتھ کرنا چاہتا ہے وہ کرے۔

البتہ یہ خیال رکھیے کہ آپ کی طرف سے کوئی بات ضد یا اشتعال دلانے والی نہ ہو بلکہ صبر وتحمل کے ساتھ اس شخص کے نفس کی اصلاح کرنے کی کوشش کیجئے جس کو جاہلیت کے غلبہ نے اس حد تک پہونچا دیا ہے کہ وہ اس آیت کا مصداق بن گیا۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی۔ (العلق : ۹-۱۰)

درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو نماز کی پابندی تک گوارا نہیں ہے۔ خود پابندی کرنا تو درکنار، دوسرا اگر کرتا ہے تو اس پر بھی بگڑتے ہیں ایسے مسلمانوں کی حالت پر اگر کبھی ہم تلخ تنقید کر جاتے ہیں تو ہمیں خارجیت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

سوال:۔

میں بغرض تعلیم اسی سال ..... چلا گیا تھا۔ ڈاڑھی رکھ کر گھر واپس آیا تو تمام دوست واحباب نے تنگ کرنا شروع کر دیا حتٰی کہ خود والد مکرم بھی بہ شدت مجبور کر رہے ہیں کہ ڈاڑھی صاف کروا دو کیونکہ اس کی وجہ سے تم بڑے بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔ اگر اصرار سے کام لوگے تو ہم تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ گھر سے نکلنے پر دوست بہت تنگ کرتے ہیں اس لیے مجبوراً خانہ نشینی اختیار کر لی ہے لیکن ستم تو یہ ہے کہ اب چند اصحاب کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ "اگر آٹھ یوم میں ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا گیا

یعنی ڈاڑھی نہ مونڈی گئی تو برادری سے متفقہ بائیکاٹ کرایا جائے گا۔ بڑی عمر میں بشوق رکھ لینا۔ مگر اب اگر رکھو گے تو زبردستی سے کام لیا جائے گا۔"

میں ڈاڑھی کو پابندی احکام شریعت میں بہت ممد پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے سینما بینی کا شوق تھا۔ مگر اب ڈاڑھی رکھنے کے بعد سینما ہال میں جانے سے شرم معلوم ہوتی ہے لیکن جب مخالفین کے دلائل سنتا ہوں تو کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہی لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر پھر یہ جذبہ کام کرنے لگ جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا میری مخالفت پر اتر آئے، میرے رویّہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ لِللہ میری رہنمائی کیجئے۔ تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو۔"

جواب :-

جب آپ نے سنت رسولؐ سمجھ کر یہ کام کیا ہے تو پھر کسی کے اعتراض و مخالفت کی پروا نہ کیجئے اور سب سے کہہ دیجئے کہ یہ ڈاڑھی رہنے کے لیے آئی ہے، جانے کے لیے نہیں آئی اس کے ہوتے ہوئے اگر میرے ساتھ تعلقات رکھ سکتے ہیں تو رکھیے اور اگر آپ کے لیے سنتِ رسولؐ اس قدر ناقابل برداشت ہے کہ اس کی وجہ سے میرے ساتھ بھی تعلق رکھنا ناگوار ہے تو بخوشی قطع تعلق کر لیجئے میرے لیے خدا اور رسولؐ کافی ہیں۔

(ترجمان القرآن رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی اگست ۴۵ء)

جذباتی اور غیر حکیمانہ طرزِ تبلیغ

سوال :-

میں نے ایک طالب علم کو جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دی اور زبانی طور پر بھی میں اس کو جماعت کے نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ نتیجہ کے

طور پر اس کا ماحول بھی اس کا دشمن ہو رہا ہے اور وہ بھی اس سے سخت بیزار ہے اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر ہجرت کر کے دارالاسلام چلا جائے۔ اس کی والدہ بعض شرائط پر راضی ہو گئی ہیں مگر والد سے اجازت ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ اس لیے اس نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ "کیا والدین کی اجازت اور مرضی کے علی الرغم دارالاسلام ہجرت کر جاؤں؟" میں نے اس کو جواب دیدیا ہے کہ مکہ سے مدینہ جانے کے قبل تمام مہاجرین نے اپنے والدین سے اجازت نہیں مانگی تھی۔" اس کا دوسرا استفسار یہ تھا کہ "کیا جماعت میری پشت پناہی پر آمادہ ہو گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں وہاں برے سلوک اور مصائب سے دوچار ہوں۔" اس کے جواب میں میں نے اس کو لکھ دیا ہے کہ گو اس کے متعلق صاف صاف کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے مگر اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ نظامِ باطل کے تحت ہزاروں روپیہ کی کمائی اور ساری دنیوی لذتیں، نظامِ حق کی جدوجہد کی خاطر فقر و فاقہ کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ رسولؐ عربی کا اسوہ جس کے اتباع کا ہم مسلمان دم بھرتے ہیں۔ ہم کو یہی بتاتا ہے مگر اس کے باوجود تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ جماعت ہمیشہ اور ہر وقت ایسے لوگوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہے جو نظامِ باطل سے بھاگ کر نظامِ حق کی طرف آ رہے ہوں بلکہ وہ ایسے لوگوں کا خیر مقدم کریگی بشرطیکہ وہ صرف حق پرست اور حق طلب ہو کر جا رہے ہوں۔"

اب ان امور سے متعلق براہِ راست آپ سے ہدایتیں مطلوب ہیں اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آگئی ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں ایک مدرسہ میں معلم ہوں۔ جب میری ان تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع حکومت کے محکمۂ تعلیمات کو ملی تو اس نے مجھ سے چند سوالات کیے جن میں مجھ سے جماعت کی حیثیت، اس کے مقاصد، امیر جماعت کی

شخصیت وغیرہ امور کی بابت استفسار کرتے ہوئے یہ جواب طلب کیا گیا ہے کہ تم ایک فرقہ وار جماعت کے رکن کیوں ہو اور فلاں طالب علم کو کیوں اس بات پر ورغلاتے ہو کہ موجودہ نظام تعلیم کو ترک کر کے خلاف مرضی والدین دیگر ممالک کو ہجرت کر جائے..... وغیر ذالک۔ فرمایئے اس مراسلہ کا کیا جواب دوں؟ میرا اپنا ارادہ تو صاف صاف اظہار حق کا ہے۔

جواب:۔

آپ نے یہ غلطی کی کہ لوگوں کو تبلیغ کی نیز تیز خوراکیں دے کر ہجرت اور ترک علائق پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ میں صحیح پوزیشن کئی مرتبہ واضح کر چکا ہوں۔ ہم ابھی تک اس مرحلہ میں نہیں پہنچے ہیں جب کہ مختلف مقامات سے اپنے سب ہم خیالوں کو ایک جگہ سمٹ آنے کی دعوت دے سکیں۔ نہ ہمارے پاس جگہ ہے نہ ذرائع ہیں، نہ صحیح معنوں میں ایسا کوئی دارالاسلام بن گیا ہے جس کی طرف دارالکفر سے ہجرت کرنا ضروری ہو اور نہ اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ "مکی زندگی" کی بھٹی سے اچھی طرح گزرے بغیر لوگ مجرد عقیدے نصب العین قبول کر کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہونے لگیں کیونکہ اس طرح وہ مضبوط سیرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی جو ایک کافی مدت تک مخالف ماحول میں کش مکش کرنے اور استقامت دکھانے سے بنا کرتی ہے۔ لہٰذا اس وقت لوگوں کو ہجرت کی دعوت دینا ہمارے کام کے لیے اصولاً غلط بھی ہے اور بے حد نقصان دہ بھی اور اس پالیسی کے خلاف بھی ہے جس پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں ہم اپنے مرکز کو ذرائع کی کمی اور مشکلات کے ساتھ بتدریج مضبوط بنا رہے ہیں اور اس مرحلہ پر صرف ان لوگوں کو بلا رہے ہیں جن کی فی الواقع ہم کو ضرورت ہے۔ اس تدریجی نقشے کے خلاف ایک زائد آدمی کا آجانا بھی ہماری مشکلات میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے پھر ہماری کوشش یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ہم صرف آزمودہ آدمیوں ہی کو بلائیں۔ جن کے متعلق ہمیں پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ ساری اسکیموں میں ٹھیک ٹھیک مددگار ہو سکتے ہیں۔ نا آزمودہ آدمیوں کے بلا انتخاب جمع ہو جانے سے بڑی

پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے اشخاص کے اجتماع سے کام میں مدد ملنے کے بجائے الٹی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جب تک میں اپنے نقشہ کے مطابق ایک صحیح و مستحکم ماحول پیدا نہ کر لوں جس پر مجھے یہ اطمینان ہو کہ اب جو اس ماحول میں آئے گا وہ اس کے ماحول میں آئے گا وہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلتا چلا جائے گا۔ اس وقت تک میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ غیر معلوم الحال اصحاب بطور خود مرکز میں آکر رہنا شروع کر دیں۔ سر دست جو لوگ مرکز میں آنے کے امیدوار ہوں ان کو ایک کافی مدت تک اپنے ماحول میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کر کے مخالفتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھا کر اپنی اس قابلیت کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ مرکز میں بلائے جانے کے لائق ہیں۔

اب اخلاقی جرأت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود ان نوجوان دوست کو لکھیں کہ آپ نے جوان کو ہجرت کرنے کی ترغیب دی تھی وہ آپ کی غلطی تھی اور آپ سے یہ غلطی جماعتی پالیسی کے خلاف سرزد ہو گئی تھی اس کے ساتھ آپ انھیں تلقین کیجئے کہ وہ ایک طرف اپنی دینی معلومات کو ضروری حد تک مکمل کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف ہماری جماعت کے نام پر کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے لٹریچر کو اچھی طرح پڑھ کر ہمارے مسلک اور طریق کار کو سمجھ لیں پھر اس کے مطابق اپنے ماحول میں ٹھیک کام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عزیز موصوف کو ان کے والد کے علی الرغم ہجرت کرنے کی رائے دی۔ اول تو مکہ میں مشرک و کافر ماں باپ کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا۔ وہ بعینہٖ ان مسلمان ماں باپ کے معاملہ میں اختیار کرنا درست نہیں ہے جو ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی غفلت و ضلالت میں مبتلا ہوں مگر بہرحال ہیں مسلمان۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلہ پر والدین کی اجازت کے بغیر، بلکہ ان کے حکم کے خلاف کوئی اقدام کرنا اولاد کے لیے جائز ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ امیر جماعت تمام شرعی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایسا کرنے کا حکم دے۔ ایسے باضابطہ حکم کے بغیر کسی شخص کا بطور خود یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ وقت والدین کی نافرمانی کر گزرنے کا ہے

کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

عزیز موصوف کا جو خط براہِ راست میرے پاس آیا ہے اس کو دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جماعت کو، اس کے نظام کو، اور اس کے طریق کار کو بالکل نہیں سمجھے ہیں اور ان کے ذہن میں جماعت کی پوزیشن کا کچھ عجیب تصور قائم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید اس جماعت نے اپنا کوئی اسٹیٹ قائم کر لیا ہے اور وہ اسٹیٹ بھی بڑا دولت مند ہے۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ انھیں یہاں آنے کے مصارف ہم بھیجیں گے۔ یہاں ان کی ضروریات کی کفالت بھی ہم ہی کریں گے اور ان کو سال میں دو مرتبہ گھر بھی ہم اپنے ہی خرچ پر بھیجتے رہا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور کو لیے ہوئے اگر وہ دارالاسلام آنے پر آمادہ نہ ہوتے تو اور کیا کرتے اور اگر ہماری دعوت ایسی ہی فیاضانہ ہو تو نیک نیت اہل ایمان میں سے کس کو اپنی نوکری چھوڑ دینے یا مدرسے سے نکل آنے میں تامل ہو سکتا ہے ان کی اس بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کا طرزِ تبلیغ بہت خام ہے جس میں فہم کا عنصر کم اور جذباتی جوش کا عنصر زیادہ ہے اسی وجہ سے ایسے لوگ جو ہمارے مسلک و طریق کار کو پانچ فی صدی بھی نہیں سمجھے ہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے ساتھ آملنے کو بچانوے فیصدی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ براہِ کرم اس طرزِ تبلیغ کی اصلاح کیجیے ورنہ جو پیچیدگی ان عزیز کے معاملہ میں پیش آئی ہے اس سے زیادہ آئندہ پیش آنے کا خطرہ ہے۔

یہ بات بھی اس سے پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب تک آپ سرکاری ملازمت میں ہیں قواعد ملازمت کے اندر رہتے ہوئے کام کیجیے اوّل تو کسی سے تنخواہ لینے کے بعد ان شرائط کی پابندی نہ کرنا جن کے تحت وہ تنخواہ دے رہا ہے اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہے دوسرے یہ کہ اگر آپ قواعد کے خلاف کام کریں گے اور اس کی پاداش میں برطرفی یا کسی اور قسم کی سزا پائیں گے تو اس سے آپ کی اخلاقی پوزیشن الٹی کمزور ہو جائے گی۔ حالانکہ اس وقت نظامِ جاہلیت کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اسلاحِ جنگ اگر کوئی ہے تو وہ اخلاق ہی ہے اس لیے آپ

نے طالب علم کو جس طرز کی تبلیغ کی اور اس کی وجہ سے جو باز پرس آپ سے ہوئی وہ ان ہدایات کے خلاف ہیں جو آپ کو مرکز سے دی گئی تھیں۔ اب آپ کو ان سوالات کے جواب میں جو آپ سے کیے گئے ہیں بالکل سیدھے اور صاف طریقہ سے صحیح صحیح بیان دینا چاہیے جواب آپ کا سخت نہ ہونا چاہیے زبان اور لب و لہجہ میں پوری معقولیت ہو۔ جو غلطی ہے اس کو غلطی تسلیم کر لیجئے اور آپ کی اور اس جماعت کی جو صحیح پوزیشن ہے اس کو بے تکلف بیان کر دیجئے۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۴ھ، نومبر، دسمبر ۴۵ء)

عملی اسلام سے اجتناب کا مشورہ

سوال:۔

تحریک اسلامی سے مجھے بہت دلچسپی ہے مگر چند روز سے ایک اہم اعتراض دماغ میں چکر لگا رہا ہے۔ جسے آپ کے سامنے رکھ کر رہنمائی چاہتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر مسلمان موجودہ طاغوتی نظام سے بالکل علیحدگی اختیار کریں تو ان کی حیثیت ہندوستان میں غلام یا اچھوت کی سی رہ جائے گی۔ پس کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ جیسے اعلیٰ دماغ حضرات مسلمانوں کو اس نظام سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش دیکر ذہنی تربیت کا کام کرتے رہیں۔ تا آنکہ پوری مسلمان قوم کی ذہنیت ایک ہی طرز فکر کی حامل ہو جائے اور پھر موقع آنے پر وہ یکدم نظام حق کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔

اگر تمام مسلمان آپ کی تحریک اسلامی کے ساتھ ہو گئے ہوتے تب تو طاغوتی نظام میں جذب ہوئے بغیر کامیابی کا امکان تھا۔ مگر اب جبکہ مسلمانوں کی اکثریت تحریک اسلامی کے نام سے بھی واقف نہیں، اور علماء جن کا فرض ہی احیائے دین کی جدوجہد ہے اس کو ناقابلِ عمل

بتاتے ہیں۔ نظامِ باطل سے کٹ کر کامیابی حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے پھر آپ کیا اس پر متفق نہیں ہوں گے کہ ابھی آپ صرف تبلیغی کام کرتے رہیں اور جب بالعموم مسلمانوں کے ذہن تحریک اسلامی کو سمجھنے لگیں اس وقت عملی کام کا آغاز کیا جائے؟

جواب:-

آپ کا مطلب جہاں تک آپ کے خط سے سمجھ میں آیا ہے یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف زبانی تبلیغ تقریر و تحریر اور مضامین و رسائل کے ذریعہ سے جاری رکھی جائے اور جن اصولوں کی تبلیغ کی جائے، ان پر نہ خود عمل کیا جائے نہ دوسروں کو ان پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔ پھر جب سارے مسلمانوں کے ذہن ہمارے خیالات سے متاثر ہو جائیں تب دفعتاً اٹھ کر انقلاب برپا کر دیا جائے۔

خیال تو بہت بے ضرر اور بے خطر ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ تبلیغ اور انقلاب کی فطرت اس کے بالکل خلاف واقع ہوئی ہے۔ مؤثر اور نتیجہ خیز تبلیغ ہوتی ہی اس وقت ہے جب کہ تبلیغ کرنے والی پارٹی اپنے اصولوں پر عمل کرتی ہے اور اس پر عمل کرنے والوں کی تنظیم کرتی ہے خالی خولی وعظ تو بہت دنوں سے اس ملک میں ہو رہے ہیں۔ ان کا کیا نتیجہ ہوا؟ یہ عجیب معاملہ ہے کہ کچھ لوگ تو ہم کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم بس لکھتے اور چھاپتے ہو۔ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے اور کچھ آپ جیسے لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ صرف لکھو اور چھاپو، مسلمانوں کو عمل کرنے کے خطرہ میں کیوں ڈالتے ہو۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ ان طعنوں اور مشوروں سے لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم اپنی دعوت اور طریقِ دعوت دونوں میں حضرات انبیاء کرامؑ کے پیرو ہیں اس وجہ سے جس کو ہمیں کوئی مشورہ دینا ہو یا ہم پر اعتراض کرنا ہو وہ اپنے مشورہ اور اعتراض پر حضرات انبیاءؑ کے قول اور عمل کی دلیل پیش کرے۔ صرف مصلحت بازی اور خیال آرائی یا اندیشہ سازی ہماری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ پس بہتر ہے کہ لوگ ہمیں اس سے معاف رکھیں۔

(ترجمان القرآن ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

اسلام بلا جماعت

سوال:۔

جو شخص آپ کی جماعت کے اصولوں کے مطابق اپنی جگہ حتی المقدور صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہا ہو وہ اگر بعض اسباب کے ماتحت باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔

اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے جو احادیث سے ثابت ہے کہ صحیح اسلامی زندگی جماعت کے بغیر نہیں ہوتی۔ زندگی کے صحیح اسلامی زندگی ہونے کے لیے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین (اقامتِ دین حق) سے وابستگی ہے اس وابستگی کا تقاضا ہے کہ آدمی اس نصب العین کے لیے جدوجہد کرے اور جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ہماری اس جماعت میں شامل نہ ہو اور کسی اور ایسی جماعت سے اس کا تعلق ہو جو یہی نصب العین رکھتی ہو اور جس کا نظام جماعت اور طریق جدوجہد بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو اس صورت میں ہم اس کو برسر ہدایت ماننے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ آدمی صرف ان طریقوں کی پابندی پر اکتفا کرتا رہے جو شخصی کردار کے لیے شریعت میں بتائے گئے ہیں اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کسی جماعت سے وابستہ نہ ہو۔ ہم ایسی زندگی کو کم از کم نیم جاہلیت کی زندگی سمجھتے ہیں۔ ہمارے علم میں اسلامیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گردوپیش ایسی کوئی جماعت نظر نہ آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی نصب العین کے لیے اسلامی طریقہ پر سعی کرنے والی ہو تو اسے سچے دل سے ایسی ایک جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جب کبھی ایسی جماعت پائی جائے وہ اپنی انانیت چھوڑ کر

ٹھیک ٹھیک جماعتی ذہنیت کے ساتھ اس میں شامل ہو جائے۔[1]

(ترجمان القرآن جمادی الاول ۶۵ھ اپریل ۴۶ء)

جماعت اسلامی کے متعلق چند شبہات

سوال:۔

جماعتِ اسلامی کی دعوت پر کچھ سنجیدہ اصحاب کی طرف سے حسب ذیل چند اعتراض پیش کیے گئے ہیں۔ براہ کرم اپنے جوابات سے آگاہ فرمائیں:۔

(۱) جماعت اسلامی کی تحریک سے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ اس خطرے کا کیا سدباب کیا گیا ہے؟

(۲) یہ تحریک محمد بن عبدالوہاب نجدی ہی کی تحریک ہے جب آپ کے ساتھ اچھی جمعیت ہو جائے گی تو آپ کا رویہ بھی ابن عبدالوہاب ہی کی طرح ہوگا۔

(۳) آپ بزرگانِ دین کا احترام بھی نہیں کرتے۔ سلف کے جن حضرات نے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں ان کی کارگزاریوں پر آپ قلم پھیر دینا چاہتے ہیں اور خود کو ان سے بہتر کام کرنے کا اہل پاتے ہیں۔

(۴) آپ ارکان جماعت اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔

جواب:۔

میں اپنی حد تک انتہائی احتیاط کر رہا ہوں اور میرے رفقاء بھی خدا کے فضل سے اس معاملے میں چوکنے ہیں کہ ہماری یہ جماعت مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ نہ بننے پائے۔ اگرچہ ہم سے اختلاف کرنے والوں میں ایک گروہ یہ دلی خواہش رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم سے اس نوعیت کی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تاکہ اصلاح کی بہت سی

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو "شہادتِ حق" از مصنف۔

پچھلی کوششوں کی طرح اس کوشش کو بھی خاک میں ملایا جا سکے[1]، لیکن الحمدللہ کہ ہمارے اندر وہ بیماریاں موجود نہیں ہیں جن کی بنا پر نئے فرقے بنا کرتے ہیں۔ ہم اس فتنہ سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہے ہم اس خطرہ کا سدباب کر رہے ہیں۔ لیکن شیطان کی شرارتوں کا ایسا کامل سدباب کہ اسے کسی طرح گھس آنے کا موقع نہ ملے۔ انبیاء علیہم السلام بھی نہ کر سکے تو ہم کیا چیز ہیں کہ اس میں پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ بندے کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اپنی حد امکان تک کوشش کرے۔ اور آگے کے لیے اللہ سے دعا[2] مانگے۔

۲۔ ہمارے لٹریچر اور کام کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ ابن عبدالوہاب نجدی کی تحریک ہے یا آگے چل کر وہی کچھ بن جائے گی تو وہ اپنی رائے کا مختار ہے۔ ہم کسی شخص کو رائے رکھنے کے اختیار سے محروم نہیں کر سکتے اور ہمارے پاس اس قسم کی فضول بحثوں کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔

۳۔ میں تمام بزرگانِ دین کا احترام کرتا ہوں، مگر پرستش ان میں سے کسی کی نہیں کرتا اور انبیاء کے سوا کسی کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں بزرگانِ سلف کے خیالات اور کاموں پر بے لاگ تحقیقی و تنقیدی نگاہ ڈالتا ہوں جو کچھ ان میں حق پاتا ہوں اسے حق کہتا ہوں اور جس چیز کو کتاب و سنت کے لحاظ سے یا حکمتِ عملی کے اعتبار سے درست نہیں پاتا اس کو صاف صاف نادرست کہہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی غیر نبی کی رائے یا تدبیر میں خطا پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عظمت و بزرگی میں کوئی کمی آئے۔ اس لیے میں سلف کی بعض رایوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی بزرگی کا بھی قائل رہتا ہوں اور میرے دل میں ان کا احترام بھی بدستور

---

[1] بلکہ بعض لوگ تو غلطی کے صدور کا انتظار کرتے کرتے جب تھک گئے۔ تو وہ زبردستی ہم کو ایک فرقہ قرار دینے پر تل گئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کا غیظ تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ معلوم نہیں آپ کے "سنجیدہ اصحاب" کن لوگوں میں شامل ہیں۔ غلطی کے صدور کا انتظار کرنے والوں میں یا بلا صدور ہی حکم چسپاں کر دینے والوں میں۔

[2] اس اعتراض کا زیادہ تفصیلی جواب "شہادتِ حق" میں دیا گیا ہے۔

باقی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ بزرگی اور معصومیت کو ہم معنی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک اصول یہ ہے کہ جو بزرگ ہے وہ خطا نہیں کرتا اور جو خطا کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بزرگ کی رائے یا طریقہ کو نادرست قرار دینا لازمی طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا خیال ظاہر کرنے والا ان کی بزرگی کا احترام نہیں کرتا اور ان کی خدمات پر قلم پھیرنا چاہتا ہے پھر وہ اس مقام پر بھی نہیں رکتے بلکہ آگے بڑھ کر اس پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا ہے۔ حالانکہ علمی معاملات میں ایک شخص کا دوسرے کی رائے سے اختلاف کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ جس سے اختلاف کر رہا ہو اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا بھی سمجھے اور اس سے بہتر بھی۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بکثرت معاملات میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ظاہر ہے یہ اختلاف یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ مختلف فیہ معاملات میں اپنی رائے کو صحیح اور امام صاحب کی رائے کو غلط سمجھتے تھے۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ دونوں حضرات امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلے میں اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے۔

۴۔ یہ الزام "کہ ہم ارکانِ جماعتِ اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں" اگر ہماری ان تمام تحریرات کو پڑھنے کے بعد لگایا گیا ہے جو ہم نے اس الزام کی تردید میں بار بار لکھی ہیں۔ تو اس کا کوئی جواب صبر کے سوا نہیں ہے۔ آخر سارے معاملات کا فیصلہ اسی دنیا میں تو نہیں ہو جانا ہے، کوئی عدالت آخرت میں بھی تو قائم ہوگی۔

(ترجمان القرآن رجب ۶۵ھ جون ۴۶ء)

ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار

سوال:-

یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان

ؔ یہ تحریریں اس کتاب میں بھی موجود ہیں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ "تفہیمات حصہ دوم" میں ملیں گی۔

کے لیے بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو۔ صرف ایک ہی چیز مقصد زندگی قرار پا سکتی ہے اور وہ ہے حکومتِ الٰہیہ کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلاً مناسبت رکھتا ہو اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً اختیار کیا ہو حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیاء کرامؑ ہیں اس لیے طریق کار بھی وہی صحیح ہے جو انبیاءؑ کا طریق کار ہو۔

انبیاءؑ کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں۔

ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک منظم اور موثر طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کارفرما نظر آتا ہے اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ سر قبیلی (PATRIARCHAL) قسم کا اسٹیٹ تھا جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے جو غالباً اسی سیاسی اختلافِ احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جو جامعیت اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آج کل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور جس قدر منظم و موثر اور مضبوط طاقت، فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً غیر ریاستی (STATE-LESS) سوسائٹی یا حد سے حد سرقبیلی حکومت میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اب بھی اس قسم کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ کیا آج کل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فنِ انقلاب انگیزی کافی حد تک بدلنا نہیں پڑے گا۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے برعکس حضرت یوسفؑ کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا چنانچہ جب انھوں نے قوتِ منسلطہ (SOVEREIGIN POWER) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ کہہ کر اقتدار سنبھال لیا۔ اور اس طرح اپنا مشن پورا کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے موجودہ زمانہ کا اسٹیٹ حضرت یوسفؑ کے عہد کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع ہمہ گیر اور منظم ہے اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا ہے بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے ان حالات میں زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کُلّی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہوگی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائے گی۔

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے بلکہ ایک منظم جماعت کی

جدوجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوت حاکمہ (SOVEREIGN POWER) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب:-

بلاشبہ ایسی حالت میں جب کہ غیر اسلامی اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اس حالت کی بہ نسبت جب کہ فاسد سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے، اصولی طریق کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریق کار (METHOD) سے لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (SUBSTANCE OF POWER) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔

(ترجمان القرآن رمضان، شوال ۶۴ھ ستمبر، اکتوبر ۴۵ء)

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال:-

اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اول کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول

پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک سے جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے لیکن باطن میں روح اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرلے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں۔ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم[1] درپیش ہے اور یہ انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے ایسی صورت میں ہم کو کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب:۔

آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے اس لیے

---

[1] اشارہ ہے ۴۶ء کے انتخابات کی طرف۔

آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آئے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔ حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نظر سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اختلافی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑتی اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چراتی ہے اس سزا سے اگر مسلمان کبھی بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصولی بنیادی جرم سے باز آجائیں۔ جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انھیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں۔ یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدباب نہ ہو گا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے قائم کر دے گی۔

آپ نے جو سوال پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ جماعت اسلامی کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجیے یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں۔ اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی

زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں پائے جاتے ہیں ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو شخص ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہونچا سکے جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھرے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارہ کر لیں۔ جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ کافرانہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کے اصول پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے

ہیں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

(ترجمان القرآن رمضان المبارک، شوال ۶۴ھ، ستمبر اکتوبر ۴۵ء)

مزدوروں کی ہڑتالوں میں جماعت اسلامی کی پالیسی

سوال:۔

"آج کل ملک میں ہڑتالوں کا دور دورہ ہے ہم لوگ جو جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور محنت پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے موقع پر کیا روش اختیار کریں۔ جب کہ ہمارے کارخانے یا محکمے میں ہڑتال ہو؟"

جواب:۔

سر دست اس معاملے میں ہماری پالیسی یہ ہے:۔

(۱) جو مزدور یا محنت پیشہ لوگ ہمارے مسلک سے متاثر ہوں وہ ہڑتالوں کے زمانے میں کام پر تو نہ جائیں لیکن ہڑتالیوں کے ہنگاموں اور مظاہروں سے بھی الگ رہیں۔

(۲) جن مطالبات کے لیے ہڑتال کی گئی ہو ان کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ آیا وہ منصفانہ ہیں یا غیر منصفانہ۔

الف۔ منصفانہ مطالبات کو تمام جائز و معقول اور پُرامن طریقوں سے تسلیم کرانے میں حصّہ لیں مگر کسی فساد اور جھگڑے میں حصّہ نہ لیں۔

ب۔ غیر منصفانہ مطالبات کے معاملہ میں اپنے ہم پیشہ ہڑتالیوں سے صاف کہدیں کہ ہم تمہارے مطالبات کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن ہم قصداً تمہاری ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتے اس لیے جب تک تم کام پر نہ جاؤ گے ہم بھی نہیں جائیں گے۔

ج۔ اگر مطالبات کا کچھ حصّہ منصفانہ اور کچھ حصّہ غیر منصفانہ ہو تو ہڑتالیوں اور مستاجروں (EMPUOYERS) دونوں کو مطلع کر دیں کہ ہم ان مطالبات کے اتنے حصّے کو صحیح اور اتنے حصّے کو غلط سمجھتے ہیں۔

(۳) جب کبھی کسی ہڑتال میں یا مزدوروں کی کسی تحریک کے سلسلہ میں سوشلزم کے نظریات کارفرما نظر آئیں (مثلاً مطالبات کی بنیاد یہ بیان کی جارہی ہو کہ طبقاتی جنگ ایک تاریخی تقاضا ہے یا مقصد و نصب العین یہ پیش کیا جارہا ہو کہ تمام ذرائع پیداوار پر سے شخصی ملکیت ختم کر دی جائے اور انھیں قومی ملکیت بنا دیا جائے) تو ایسے کسی موقع پر خاموش نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ ان نظریات کی کھلم کھلا تردید کرنی چاہیے۔ اور مزدوروں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نظریات بجائے خود بھی غلط ہیں اور ان میں تمہاری اپنی فلاح بھی درحقیقت مضمر نہیں ہے۔ ان کے بجائے زیادہ صحیح اصول یہ ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔ حقیقی انصاف اگر قائم ہو سکتا ہے تو ان اصولوں پر ہی ہو سکتا ہے۔ آخر کار جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں اشتراکیوں کے زیر اثر نہ رہیں بلکہ ہمارے زیر اثر آجائیں تاکہ ہم طبقاتی جنگ کی بجائے طبقاتی صلح اور مارکسی اشتراکیت کے بجائے اسلامی عدل کے اصولوں پر محنت پیشہ طبقوں کو ان کے جائز حقوق دلوا سکیں۔

(ترجمان القرآن رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

ملکی فسادات میں ہمارا فرض

سوال :-

ہم ایک ہندو اسٹیٹ میں رہتے ہیں جہاں برطانوی ہند کے مقابلے میں کتنی ہی زائد پابندیاں عائد ہیں۔ محض نماز روزے کی آزادی ہے اور یہ آزادی بھی برادرانِ وطن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ ان کو تو ہمارے نام سے نفرت ہے اور جو مسلمان جتنا ہی زیادہ پابند شرع ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان کے بغض کا مستحق ہے ان حالات میں آپ کا یہ کہنا کہ "جماعتِ اسلامی کی پالیسی تو فسادات میں غیر جانبدار رہنے کی ہے۔" اور یہ کہ "یہ جماعت تو مظلوم کو مظلوم اور ظالم کو ظالم کہے گی۔ اور بوقت ضرورت بے لاگ گواہیاں دے گی"۔ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ میرے ایک دوست پوچھتے ہیں کہ کیا ہم اس وقت تک خاموش بیٹھے رہیں جب کہ ہمیں گواہی دینے کا موقع آئے؟ شہر میں فساد کے شعلے بھڑک اٹھیں اور ہم بس یہ دیکھتے رہیں کہ کون کس پر ظلم کرتا ہے؟ پھر جو قوم صرف مسلمان کے نام کی دشمن ہے وہ ایسے مواقع پر خود ہم پر ہاتھ اٹھانے سے کب باز رہ جائے گی؟ وہ اس بات کا لحاظ ہی کیوں کرنے لگی کہ یہ فساد میں شریک نہیں ہیں۔ صرف تماش بین کی حیثیت رکھتے ہیں نیز اگر میرے کسی مسلمان پڑوسی پر غیر مسلموں نے ظالمانہ طور پر حملہ کر دیا تو اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لیے یہ جائز کیسے ہو سکتا ہے کہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہوں اور اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں نہ ڈال دوں۔

موصوف یہ سوال کرتے ہوئے بطور خود کتاب و سنت کی روشنی میں اس کے دو حل بتاتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ اگر ہم مقابلے کی قدرت رکھتے ہوں تب تو اپنی مدافعت کی خاطر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ ہم اقلیت میں ہیں اس لیے ایسی جگہ ہجرت کر جائیں جہاں ہماری اکثریت ہو۔

امید ہے کہ آنجناب ان حالات میں ہماری مناسب رہنمائی فرمائیں گے۔ ادھر ریاست کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں پچاس فی صدی بالکل جاہل اور آبا پرست اور پچیس فیصدی نیم خواندہ مگر پکے پیر پرست۔ بقیہ پچیس فیصدی تعلیم یافتہ مگر ان میں سے بیس علم دین سے کورے، اور خانقاہیت سے متاثر، اور باقی پانچ دنیا کے بندے۔

جواب:-

آپ نے ریاست گوالیار کے مسلمانوں کی جو حالت لکھی ہے اس کو پڑھ کر افسوس ہوا۔ لیکن افسوس کرنے سے وہ حق ادا نہیں ہوتا جو ہم پر اور آپ پر عائد ہوتا ہے۔ بندگانِ خدا جس قدر زیادہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ ایک مومن پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے کوشش کرے۔

آپ نے جن صاحب کا سوال نقل کیا ہے ان کی خدمت میں میری طرف سے عرض کر دیجئے کہ اگر سوال محض بیٹھنے اور تماشہ دیکھنے کا ہوتا تو یقیناً میرا جواب کچھ اور ہوتا۔ میں نے جو جواب اس سے پہلے متوقع فساد کے سلسلہ میں دیا تھا وہ دراصل ان لوگوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیا تھا جو جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی محض بیٹھ کر تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں بنی ہے۔

اس جماعت کے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ دنیا میں خیر و عدل کا نظام قائم کرنے کے لیے جد و جہد کریں۔ اس جد و جہد میں یہ ضروری ہے کہ وہ قومی نفسانیتوں اور قومیت کے جھگڑوں سے الگ رہ کر خالص حق کے حامی و داعی کی حیثیت

سے کام کریں ۔ بلاشبہ عامۂ مسلمین کے ساتھ ان کا قومی تعلق ضرور ہے اور اگر عام مسلمانوں اور ان کے غیر مسلم ہمسایوں کے درمیان فی الواقع دین کی بنا پر لڑائی ہو تو اس سے الگ رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ مسلمان دین کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور نہ وہ کشمکش جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان برپا ہے اس کی بنیاد یا اس کا مقصود دین ہے ۔ اس لیے ہم اس کشمکش میں مسلمانوں کے مبتلا ہونے اور مظلوم یا ظالم بننے پر افسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

ہماری یہ عدم شرکت اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم محض تماشبین ہونے کی حیثیت سے بیٹھے دیکھتے رہیں گے، بلکہ ہم عملاً فسادیوں کو نیکی اور انصاف کی تلقین کریں گے برائی سے روکیں گے ۔ ظالم کی مخالفت کریں گے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ۔ مظلوم کی حمایت کریں گے ۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں گے کہ ہم فی الواقع انصاف کے علمبردار اور بھلائی کے داعی ہیں ۔

اس سلسلہ میں ایک شبہ اور باقی رہتا ہے جس کو صاف کرنا ضروری ہے ۔ وہ یہ کہ ہم خواہ کتنے ہی انصاف کے ساتھ غیر جانبدار بنیں لیکن جب تک ہمارے نام، لباس اور معاشرت دوسرے مسلمانوں سے مشترک ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود بھی ان کے مظالم کے اندر رہ کر ان بے انصافیوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائیں جو کسی مقام کی غیر مسلم اکثریت غلبہ پانے کی صورت میں عام مسلمانوں پر کر رہی ہو؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اگر آپ کسی مقصدِ عظیم کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو اس جدوجہد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی تمام قوتوں کو صرف اسی ایک مقصد کی خدمت کے لیے وقف رکھیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جو اس مقصد کو نقصان پہونچانے والا ہو۔ اس طرزِ عمل پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنے میں جو خطرات اور نقصانات بھی ہوں، بہرحال ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مسلمان کے لیے اس کے تحفظ کی کوئی گارنٹی اس کے اپنے اخلاق کے سوا نہیں ہے عام مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس وقت جس حالت میں مبتلا کرلیا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کے لیے جینا اور مرنا چھوڑ دیا ہے اور ان اخلاقِ فاضلہ سے بھی کنارہ کشی کرلی ہے جو اہل ایمان کے امتیازی اخلاق تھے اسی چیز نے ان کو کمزور بھی کیا اور ان کے وقار کو بھی صدمہ پہونچایا۔ اب اگر اس حالت سے آپ نکل سکتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ انہی غلطیوں میں اور انہی کے نتائج میں الجھتے چلے جائیں جو اب تک ہوتی رہی ہیں بلکہ صرف اس طرح نکل سکتے ہیں کہ جس جس مسلمان کو بھی ہوش آتا جائے وہ نفسانیت اور دنیا پرستی سے بالاتر ہو کر دعوت الی الخیر کو اپنا مشغلۂ زندگی بناتا جائے اور ان اخلاقِ فاضلہ سے اپنے آپ کو سنوارے جو داعیانِ حق کے شایانِ شان ہوں۔ جو شخص بھی ایسا کرے گا وہ اپنے گردو پیش کے سارے انسانوں پر خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اپنا ایسا اخلاقی وقار قائم کردے گا، جو کسی پولیس اور فوج کی مدد سے قائم نہیں ہوسکتا۔

آپ کہتے ہیں کہ ہم ہندو ریاست میں ہیں اور قلیل التعداد ہیں اور وہاں مسلمانوں کے لیے کوئی عزت اور امن نہیں ہے لیکن کیا آپ بھول گئے ہیں کہ اب سے آٹھ نو سو برس پہلے خواجہ معین الدینؒ اجمیر کی ہندو ریاست میں جب آکر مقیم ہوئے تھے تو حالات اس سے بہتر تھے یا بدتر؟ اس وقت کس چیز نے ان کی حفاظت کی تھی۔

میرے برادران دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمہارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے اسے ادا کردو۔

(ترجمان القرآن، رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

قضیۂ فلسطین میں جماعت کا رویّہ

سوال :۔

بعض اصحاب پوچھتے ہیں کہ فلسطین کی سیاست میں امریکہ اور برطانیہ کی خود غرضی و اسلام دشمنی کے نتائج آشکارا ہیں جماعتِ اسلامی نے اس معاملہ میں کبھی اپنی پالیسی کا اظہار کیوں نہ کیا؟

جواب :۔

ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکہ سخت ظلم کر رہے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے معاملے میں انھوں نے بے انصافی کی حد کر دی ہے۔ اہل فلسطین سے ہمدردی کرنا ہر انسان کا انسانی فرض ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ فرض کئی گنا زیادہ سخت ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کریں۔ پھر فلسطین کا مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر خدانخواستہ وہاں یہودی ریاست بن گئی تو اس سے مرکزِ اسلام (حجاز) کو بھی متعدد قسم کے خطرات لاحق ہو جائیں گے اس معاملہ میں دنیا کے مسلمان مدافعت کے لیے جو کچھ بھی کریں ہم ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین یا ہندوستان یا ایران یا ٹرکی کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کش مکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اسی مسئلہ پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہوگا دوسرے مسائل کے حل ہو جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن، شوال ۶۵ھ، ستمبر ۴۶ء)

نظامِ اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب

سوال :۔

جن لوگوں سے پاکستان کے آئندہ نظام کے متعلق گفتگو ہوتی ہے وہ

اکثر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ اور دوسرے اہل علم اسلامی
حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی
میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ اس سوال سے صرف مجھ کو ہی نہیں دوسرے
کارکنوں کو بھی اکثر و بیشتر سابقہ پیش آتا ہے گو ہم اپنی حد تک لوگوں کو بات
سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ آپ اس سوال کا
جواب ترجمان القرآن میں دیں تاکہ وہ بہت سی غلط فہمیاں صاف ہو سکیں
جن پر یہ سوال مبنی ہے۔

جواب :-

آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مفصل جواب تو سر دست نہیں دیا جا سکتا لیکن مختصر طور پر میں ایک بات عرض کروں گا جس سے امید ہے کہ آپ معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی ہو۔ جہاں کا سیاسی و معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو اور جہاں ایک مجرد سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکایک نوبت آگئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر اٹکا ہوا ہو۔ کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار لوگ اسے نافذ کر دیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلمین یا بینک کے اسٹاف کو دیدیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں شاید دستور کو انھوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے۔

واضح طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص

اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انھوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کریں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں (جنھیں ہم نے اپنے مطالبہ میں بیان کر دیا ہے) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے۔ پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہوگا جو قیام پاکستان کی راہ میں انھوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں

پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

امید ہے کہ اس توضیح سے لوگ ہماری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ہم کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرنا چاہتے۔ سر دست ہم نے اسلامی نظام کے بنیادی امور کو ایک مطالبہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو دستور سازی کے کام میں جس حد تک ممکن ہوگا ہم پوری مدد کریں گے لیکن اگر سرے سے یہ بنیادی امور ہی برسرِ اقتدار لوگوں کو منظور نہ ہوں تو پھر دستور کا خاکہ پیش کرنے سے آخر کیا فائدہ متصوّر ہے:

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۶۷ھ ستمبر ۴۸ء)